

پشیمان

ابوالخیر احمد جمیل غازی پوری

طبع اول ——— اپریل ۱۹۷۵ء

تعداد ——— ۵۰۰

کتابت ——— جاوید اختر صدیقی

طابع ——— اللہ والا پرنٹنگ پریس کراچی

قیمت ——— آٹھ روپے

انتساب

اپنے باپ اور بڑے بیٹے کے نام جن دونوں نے

صرف چھتیس ۳۶ چھتیس ۳۶ سال کی عمر پاکر مجھے چودہ ۱۴ اور

اٹھاون ۵۸ سال کی عمر میں داغ مفارقت دیا۔

طبع اول — [illegible]
تعداد — ٥٠٠
کتابت — [illegible]
مطبع — [illegible]
قیمت — [illegible]

فہرست



مصنف

پیش لفظ

میں نہ کوئی ادیب ہوں، نہ شاعر، نہ صحافی، بس ایک سیدھا سادا مدرس ہوں، جو اپنے شاگردوں کو اپنا سب کچھ دے کر، اُن کو اپنے سے اونچے مقام پر پہونچانا اپنا مقصد زندگی سمجھتا ہے ــــ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اُس نے مجھے اپنے پیشہ میں، میری توقع اور میری اہلیت سے زیادہ کامیابی بخشی ــــ

میں جب چودہ سال کا تھا تو میرے والد بزرگوار، ابوالخیر محمد زبیر مرحوم ڈپٹی کلکٹر (یو پی) چھتیس سال کی عمر میں، مجھے اپنے سایۂ عاطفت سے محروم کر گئے ــــ میں اُن کی پانچ اولاد میں سب سے بڑا تھا، میری بیوہ ماں کے علاوہ میرا کوئی سرپرست نہیں تھا، جو سوتیلے عزیز تھے، وہ دوست سے زیادہ، دشمن ثابت ہوئے ــــ میں ابھی کالج ہی میں تھا کہ میرے حالات نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی، اور اپنے چھوٹے بھائیوں کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے، مدرسی کا پیشہ اختیار کروں، اُس زمانہ میں یو پی میں پرائیوٹ طور پر تعلیم حاصل کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ اللہ کے فضل سے میری یہ کوشش بار آور ہوئی، اور میرے چھوٹے بھائیوں کو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی، اُس کے بعد خود میرے بچوں کی تعلیم کا سوال پیدا ہوا، اُن میں سے ابھی کسی کی بھی

تعلیم پوری نہیں ہوئی تھی کہ ملک تقسیم ہو گیا - میرے وطن غازی پور (یوپی) سے ڈھاکہ قریب تھا، وہاں ہجرت کی، دو سال وہاں بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دی ــ مگر مجھے جلد ہی وہاں آنے والے طوفان کی آہٹ مل گئی، اور سنہ ۱۹۵۰ء میں بچوں کو لے کر کراچی کے لئے چل پڑا - میں نہ کبھی سرکاری ملازم تھا، نہ تاجر، نہ صنعت کار، نہ زمیندار، بس ایک پڑھنا پڑھانا آتا تھا، اللہ کا نام لے کر وہی کام یہاں بھی شروع کر دیا، میرے بچے خود پڑھتے بھی تھے، اور میرے ساتھ پڑھاتے بھی تھے، میرا گھر اچھی خاصی ایک درس گاہ بن گیا، پندرہ سال میں، میرے اپنے چھ بیٹے، اور تین بیٹیوں کے علاوہ، جانے کتنے بچے اس چھوٹی سی درس گاہ سے "فیضیاب ہوئے"، آج کراچی کے اکثر دفتروں میں کوئی نہ کوئی میرا شاگرد موجود ہے ــ میں نے اپنے بڑے بیٹے "ابوالخیر محمد طفیل مرحوم" کو کامرس گریجویٹ کرا کے بینک میں ملازم رکھوایا، سنہ ۱۹۵۵ء میں اُس کو بینک کی اعلیٰ ٹریننگ کے لئے لندن بھیجا، وہ وہاں دس سال رہ کر خاصی ترقی کر رہا تھا کہ سنہ ۱۹۶۴ء میں گھر والوں سے ملنے کراچی آیا، کوئی تین چار مہینے یہاں رہا، پھر لندن واپس گیا، اور اچانک چند ہفتوں میں، وہی والد صاحب مرحوم کی چھتیس سال کی عمر کو پہنچ کر، مجھے داغ مفارقت دے گیا، اور اٹھاون سال کی عمر میں میری کمر ٹوٹ گئی، پھر بھی جوں توں دو سال اور میں نے کھینچے، ساٹھ سال کی حد پار کر کے پلنگ پر گر پڑا، چار سال تک مسلسل موت و زیست کی کشمکش میں رہا، پانچ مرتبہ اسپتال میں داخل ہوا، میرے معالج میری زندگی سے مایوس ہو گئے ــ اُس وقت میری تینوں بچیاں کنواری تھیں، میرے خالق کو میرے حال پر رحم آیا، اور میں ایک بار پھر اُس کے حکم سے، اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنی تینوں بچیوں کو، اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر اُن کے گھر رخصت کر دیا - اس دوران میں بفضلہ میرے سب لڑکے، اور میرے وہ شاگرد بھی جن کی تعلیم میں نے اپنے بچوں کی طرح کی تھی، برسر روزگار ہو گئے ــ کارے دنیا کسے تمام نہ کرد، مگر میں اپنے خیال میں، اپنے کاموں سے، اللہ کے فضل سے بالکل نبٹ گیا - اور اب

اڑسٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر دم واپسیں برسرِ راہ ہے۔ قوائے جسمانی، اتنی طویل جد و جہد سے تھک کر، اب جواب دینے لگے، حافظہ، جس پہ کبھی بڑا ناز تھا، وہ بھی ساتھ چھوڑنے لگا، تو یکبارگی جی میں آیا کہ اپنی طویل زندگی کے کچھ مشاہدات، افسانوں کی شکل میں منتقل کر دوں ـــــ مگر اس کی طباعت اور اشاعت کی منزل کٹھن تھی، اس کے لئے میرے شاگردِ رشید پروفیسر علی اوسط صدیقی تیار ہو گئے، سو میں نے وقت کاٹنے اور دل بہلانے کے لئے یہ مشغلہ شروع کر دیا، عمر کے اس انحطاط کے دور میں میرا یہ اقدام کچھ لوگوں کو بالکل عجیب معلوم ہو گا، مگر زندگی کے یہی عجیب واقعات افسانہ ہوتے ہیں، اور اس مجموعہ میں قاری کو اسی طرح کے افسانے ملیں گے، اس میں کسی کسی کو اپنی تصویر بھی نظر آئے گی، اور کہیں کہیں میری بھی ـــــ

میرے افسانوں پہ ایک اعتراض ہے، اور وہ اپنی جگہ صحیح ہے، یعنی میرے اکثر افسانے تعلیمی دنیا سے ہی متعلق ہیں، اُن میں کہیں نہ کہیں اُستاد یا شاگرد کا ذکر ضرور آتا ہے ـــــ اس کی دو وجہ ہے، ایک تو یہ کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میں مسلسل اسی دنیا میں سانس لے رہا ہوں، دوسرے یہ کہ جو قاری بھی ان افسانوں کو پڑھے گا، اس کی اپنی زندگی کا بہترین زمانہ، کچھ نہ کچھ مدت کے لئے، تعلیمی دنیا میں ضرور بسر ہوا ہو گا، اس لئے اُس کو یہ ماحول اجنبی نہیں معلوم ہو گا ـــــ وہ ان افسانوں میں کتنوں کو پسند کرے گا، اور کتنوں کو ناپسند، یہ نظر اپنی اپنی، پسند اپنی اپنی کا معاملہ ہے، میں نے نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا کر کے، جو کچھ لکھا ہے، اُس کے عوض دو لفظ خیر کا طلبگار ہوں، اور بس!

اس موقع پر محمود شام صاحب، ایڈیٹر ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی کا خاص طور پر شکریہ ادا نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی، اُنہوں نے میرے افسانوں کو اپنے پرچہ میں شائع کر کے میری بڑی ہمت افزائی کی، وہ ادیب بھی ہیں، اور ادب نواز بھی، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ـــــ ساتھ ہی ساتھ مجھے ہمدرد دواخانہ کے حکیم غلام ربانی، اور جناح اسپتال کے، ڈاکٹر خواجہ ذکی حسن، ڈاکٹر محمد شریف، اور ڈاکٹر سید حامد شفقت کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جن کی دوائیں کھا کر میں نے اپنے بیشتر افسانے لکھے ہیں ـــ

فون نمبر:- ۶۸۲۸۴۲ ابوالخیر احمد جمیل غازی پوری
〃 〃 ۶۱۰۳۸۹ "جمیل ولا" ۹/۷۶۵، دستگیر سوسائٹی، کراچی ۳۸

"پُر مسرت ازدواجی زندگی گذارنے کی کہانی ایک انگریز خاتون کی زبانی" اس مجموعہ میں شائع ہوتے سے رہ گئی ہے، وہ ایک کتابچہ کی شکل میں علیحدہ شائع ہو رہی ہے ـــ خواہش مند حضرات، مصنف سے "جمیل ولا" ۹/۷۶۵- دستگیر سوسائٹی کراچی ۳۸ کے پتہ پر طلب کر سکتے ہیں ـــ اور اس سلسلہ میں معلومات فون نمبر ۶۸۲۸۴۲ اور ۶۱۰۳۸۹ پر کی جا سکتی ہیں ـــ

(مصنف)

ناولٹ

پشیمان

(قسط اوّل)

ممتاز نے کرسچین کالج میں داخلہ لیا، کالج ہوسٹل میں قیام کیا، ہوسٹل کے قریب ہی اُس کی خالہ کا مکان تھا، وہ اُس کو اکثر بلاتیں، مگر دن میں کالج شام کو فیلڈ، رات کو پڑھائی، اُس کو وہاں جانے کی فرصت بہت کم ملتی، وہ کبھی کبھی، رفع شکایت کے لئے وہاں چلا جاتا —— کچھ عرصہ کے بعد، اُس کے خالو کے بھائی فرید، تبدیل ہو کر وہاں آ گئے، کوٹھی موروثی تھی، وہ نچلی منزل میں آباد ہوتے —— ایک روز ممتاز اپنی خالہ سے ملنے گیا تو دیکھا اُن کے پاس ایک نئی لڑکی بیٹھی ہوئی ہے، وہ دفعتاً چونک کر، پردہ کے انداز میں سرنگوں ہو گئی، ممتاز اُلٹے پیر واپس چلا آیا —— وہ تو یوں بھی وہاں بہت کم جاتا تھا، اب اُس نے اپنے معمول میں اور کمی کر دی، بس اتوار کے اتوار، یا کسی تعطیل کے دن، خالہ کو سلام کرنے، چلا جاتا —— خالہ کی بڑی بیٹی طاہرہ

اُس کے وطن میں بیاہی ہوئی تھیں، وہ اُن سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ میکے آئیں تو اُنہوں نے ممتاز کو، ہوسٹل چھوڑ کر کوٹھی پہ اُٹھ آنے کو کہا، مگر ممتاز کی ماں نے اس کی اجازت نہیں دی، اُن کو اپنے بہنوئی کے لڑکے الور سے غلط فہمی کا ڈر تھا۔۔۔۔ مگر طاہرہ کے اصرار پہ ممتاز اب وہاں، قریب قریب روزانہ شام کو جانے لگا۔۔۔۔ وہ وہاں جب بھی جاتا صبیحہ طاہرہ کے پاس موجود ہوتی، ممتاز کو اُس کے پردہ کا علم تو پہلے ہی روز ہو گیا تھا، اب وہ خود اُس کا سختی سے خیال رکھتا، پھر بھی آتے جاتے اکثر اُس سے سامنا ہو ہی جاتا۔۔۔۔ لڑکی ضرور قبول صورت تھی، حسین بھی کہہ سکتے ہیں، مگر ہوش ربا کہنا مشکل ہے، کم از کم ممتاز کو ویسی نہیں معلوم ہوئی، ممکن ہے اس کی وجہ ممتاز کا مختلف معیار پسند ہو، وہ خود لانبا چھریرے بدن کا نوجوان تھا، صبیحہ قدرے گداز بدن، میانہ قد، اور گول چہرہ کی لڑکی تھی۔ مزاج کی تیز، برتاؤ میں خشک، بہت کم آمیز، اور کم سخن۔۔۔۔ اور ممتاز بالکل برعکس تھا، بات کرنے کا تو اُس کو جیسے مرض تھا، اُس کے انگریز پرنسپل نے اُس کو سیزرس (قینچی) نام دے رکھا تھا۔ پھر بھی ایک ایسی دوشیزہ سے، جو فطرۃً خاموشی پسند تھی، اور پردہ کرتی تھی، اُس نے بات چیت کرنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی، یوں تو روز کے آنے جانے والوں سے پردہ کچھ ڈھیلا ہو ہی جاتا ہے۔۔۔ ممتاز کو اب طاہرہ کے ہاں صبیحہ کی جھلکیاں زیادہ نظر آنے لگیں، مگر وہ اُن کو اتفاقی ہی جھلکیاں سمجھتا رہا، بلکہ اُس کے علم میں صبیحہ کی بیگانگی، گھٹنے کی بجائے روز بہ روز، بڑھتی ہی رہی۔۔۔۔ کسی شخص سے برابر ملاقات ہونا، اُس کا مُنہ پھیر لینا، بات نہ کرنا، انتہائی بیگانگی نہیں، تو کیا ہے۔۔۔ اس عمداً بیگانگی کے خیال نے ممتاز کو صبیحہ کی طرف سے بالکل بے حس بنا دیا، بس جب اُس کی جھلک وہاں نظر آئی تو ممتاز کو اُس کی موجودگی کا خیال آجاتا۔۔۔۔ صورت

تو اُس کی، تھوڑی تھوڑی کر کے، اب اچھی طرح دیکھی جا چکی تھی، پوشش میں وہ اتنی وضعدار تھی کہ بار بار بھی اُسے دیکھنے میں، کوئی خاص کشش پیدا نہ ہوتی ــــ اُس کی خاموشی، اور پوشش کی یک رنگی اب ممتاز کو کھلنے لگی ــــ مگر اُس کی ایک ادا ممتاز کو ضرور انوکھی معلوم ہوئی، وہ اچانک سامنا پڑ جانے پر، اوروں کی طرح، پردہ کے لئے دوڑ بھاگ بالکل نہ کرتی، حتیٰ کہ اپنے چہرہ پر آنچل بھی نہ کھینچتی۔ بس بیٹھے کے بیٹھے، ذرا کے ذرا، اپنی آنکھیں یوں نیچی کر لیتی گویا یہ پردہ تم سے نہیں، صرف اوروں کو دکھانے کے لئے ہے، تم جو ہمیں دیکھ رہے ہو اس کی ہم کو فکر نہیں ہے، اُس کی یہ خاص ادا ممتاز کو بڑی بھلی معلوم ہوئی، مگر اُس نے طاہرہ کے ذریعہ کبھی اس پردہ کی مصلحت دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی ــــ البتہ اب جب بھی اُس کا سامنا ہوتا تو ممتاز اُس کی اس ادا کو خاص طور پر غور کرتا، رفتہ رفتہ اس کو اس میں ایک عجیب دلکشی محسوس ہونے لگی۔ کبھی کبھی وہ خلافِ معمول، انجان بن کر، عمداً اُس کے سامنے آ جاتا، اور اُس کی اس ادا کو، ہر پہلو سے، غور کرتا ــــ کئی بار ایسا ہوا کہ صبیحہ، طاہرہ کی بجائے، اُس کی خالہ کے پاس بیٹھی ہوتی، اور ممتاز وہاں اچانک پہنچ جاتا، اُس کی خالہ صبیحہ کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کرتی، مگر وہ اس اشارہ کو نظرانداز کر کے، اپنے خاص طریقہ کار پر عمل کرتی ــــ ایک بار وہ خالہ کے پاس بیٹھی تھی، کوئی اچانک آ گیا، وہ پردہ کی غرض سے اُٹھی، پھر دیکھا کہ یہ ممتاز ہے، جھٹ اپنے مخصوص طریقہ پر وہیں بیٹھ گئی، اس قلابازی پر ممتاز اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا، اور واپس چلا گیا ــــ پردہ کی یہ دھوپ چھاؤں کی شکل کئی مہینے تک چلتی رہی ــــ اسی دوران میں کوٹھی پر ایک روز بیت بازی کی ٹھہری، گھر کے سب لوگ اس میں شریک ہوئے، اور ممتاز بھی تو گویا گھر ہی کا ایک فرد تھا ــــ پارٹی کی تقسیم جنس کی بنا پر ہوئی، زنانی پارٹی ہار گئی، ان کو شرط

کے روپئے دینے پڑے، بڑی کرکری ہوئی ـــ اُسی وقت جوابی مقابلہ کا چیلنج پیش ہوا، اُس کے لئے آئندہ اتوار طے ہوا ـــــ دوسرے روز ہاکی کھیلتے ہوئے ممتاز کے پیر میں چوٹ آگئی، وہ فیلڈ سے آج، معمول سے قبل، لوٹ پڑا، طاہرہ کے یہاں آکر اپنے گھٹنے سنکوائے، اور جس وقت وہاں روز آتا تھا، آج وہ اُس وقت وہ کوٹھی سے ہوسٹل جانے کے لئے روانہ ہوا، راہداری میں صبیحہ سے، روبرو مڈبھیڑ ہوگئی، وہ سہمی، یہ ٹھٹکا، پھر صبیحہ کو راستہ دینے کے لئے، تیزی سے، لنگ کرتا ہوا، آگے بڑھ گیا، مشکل سے اُس نے ابھی چند ہی زینے طے کئے تھے کہ طاہرہ کی آواز آئی ـــ "ممتاز" ـــ وہ لوٹ پڑا، صبیحہ کمرہ کے اندر تھی، لہٰذا وہ دروازہ ہی پر رک گیا، اور وہ دونوں بھی وہیں آگئیں، بند پلّے کے آڑ میں صبیحہ تھی، اور کھلے حصہ میں طاہرہ ـــــ طاہرہ نے گفتگو شروع کی "دو بھٹی میں تو بھول گئی تھی، صبیحہ نے ابھی یاد دلایا ہے، ایکی تم یہ "ع" "غ" پر زیادہ اشعار نہ توڑ نا ـــ" مگر پارٹی میں رہ کر تو یہ گریز غداری ہوگی" ممتاز نے عذر کیا ـــ "تم اب بڑے مہاتما ہو گئے" طاہرہ بے ساختہ ہنس پڑیں "تم کو یہ تو کرنا ہی ہوگا ـــــ "یوں آپ کہیں تو میں پارٹی سے ہی علیحدہ ہو جاؤں، مگر پارٹی میں رہ کر تو مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا" ـــ "کیا میرے بھی کہنے پر؟" طاہرہ نے، ایک دعوے کے انداز میں، حیرت ظاہر کی ـــــ "دہوکہ تو میں کسی کی بھی خاطر نہیں کروں گا" ممتاز نے جواب دیا "یوں آپ کو میری آزمائش ہی منظور ہے تو کوئی جان جوکھوں کا کام سپرد کیجئے ـــــ "نا، بابا!" طاہرہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا "تم جگ جُگ جیو، میں کسی کی جان وان نہیں لیتی، مگر ہاں مجھے بھی یہ دیکھنا ہے کہ تمہارا یہ اصول کب تک قایم رہنا ہے ـــ "کیوں؟" ممتاز نے وجہ پوچھی ـــ "محبت"، "خوف"، اور مروت میں کتنوں کے اُصول پسپا ہو گئے" طاہرہ نے

اپنے دعوے کی تائید میں، ایک ماہر وکیل کی طرح، بحث شروع کی ——
بات سے تو بات نکلتی ہے، اور جب عورت اور مرد، دو مختلف زاویوں
سے، بات کر رہے ہوں، وہ کاہے کو ختم ہو، گھنٹہ سے زائد ہو گیا، اب ممتاز
اور طاہرہ کی گفتگو دو متوازی خطوط پر چل نکلی، نہ اتصال ہوتا، نہ ختم ہوتی
—— فیلڈ کی دوڑ، چوٹ کی تکلیف، استادگی کی تکان، ممتاز کے سپیر
جواب دینے لگے، اُس نے سہارے کے لئے بند پٹے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا،
معاً وہ اُچھل پڑا، جیسے بچھو نے ڈنک ماردیا، یا بجلی کا تار چھو گیا ——
جاڑے کی رات، جرسی اور نکر میں، اُس کا سارا جسم دفعتاً پسینے سے تر ہو گیا۔
—— روشنی وہاں سے کافی دور تھی، تاریکی میں، اُس کو کچھ معلوم نہیں ہوا،
بند پٹے پر جہاں اُس کا ہاتھ پڑا وہاں پہلے سے کوئی اور بھی ہاتھ موجود تھا،
اتفاقاً دونوں کی اُنگلیاں، ایک دوسرے کے جوڑ میں پڑ کر، اچانک گتھ
گئیں، اور دونوں جانب سے، یک بہ یک، دب گئیں، ممتاز کی اُنگلیوں نے
پہلے جنبش کی، یا صبیحہ کی، کچھ پتہ نہیں، لمحہ کی بات تھی، دبیں بھی یا نہیں، کون
جانے، ممتاز کا دماغ تو، آنِ واحد میں، بالکل ماؤف ہو گیا تھا، وہ اُنگلیاں
اُس کو سانپ کی طرح ملائم معلوم ہوئیں، اور سانپ ہی کا کام کر گئیں ——
ممتاز نے بوکھلاہٹ میں اپنا ہاتھ فوراً دروازہ سے کھینچ لیا، صبیحہ نے کیا کیا، اُس کو
علم نہیں ہوا —— مگر اس ذرا سے واقعہ نے، اُس کے دل و دماغ میں، ایک
عجیب سی بے چینی پیدا کر دی، کیف و سرور، پھر بھی ایک اُلجھن —— اُس کی
دبی ہوئی اُنگلی میں، بار بار، ایک برقی رو دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی، اُسے
دیر تک نیند نہیں آئی، سویا کم، خواب زیادہ دیکھے —— آج اُس کو پہلی بار
صبیحہ خواب میں دکھائی دی، وہ اُس کے سرہانے، خاموش کھڑی، اپنی دبی

ہوئی اُنگلی، دانتوں میں دابے، اُس کی کمزوری پر مسکرا رہی تھی، ——
گھبرا کر ممتاز کی آنکھ کھل گئی، دیکھا تو اخبار والا ہے، وہ اپنے آپ پر ہنس پڑا
—— اُس نے اخبار پڑھ کر اپنے خیالات بدلنا چاہا، مگر خیال، وہ بھی بیس سال
کی عمر کا، توبہ کیجئے، بزرگوں کی نہ سُنے —— مگر اپنے ہی قابو میں کب رہتا ہے،
بہت زور لگاؤ، تربیت اور تعلیم سے، ذرا دب جائے گا، لیکن وہ اپنی خو
تو چھوڑنے سے رہا، وہ تو پالتو ہاتھی ہے، جب تک قابو میں ہے، ہے، بگڑ گیا
تو بہتوں کو گھائل کرنے لگا، اور خود بھی گھائل ہوگا، —— وہ اخبار پڑھ رہا ہے،
اُس پر اُسے صبیحہ کی اُنگلیاں رینگتی نظر آ رہی ہیں، اُس کو اپنے اوپر غصہ آیا،
جھلا کر اخبار پھینک دیا، اور پلنگ سے اُٹھنا چاہا، دیکھا تو حشمت ——
"خیریت تو ہے؟" ممتاز نے چونک کر پوچھا "اتنے سویرے کیسے آئے؟"
—— اُس نے خاموشی سے ایک بند لفافہ بڑھا دیا۔ ممتاز نے سمجھا قمر یا فرید
کا ہے، سہولت سے کھولا، دیکھا القاب ندارد، دستخط پر غور کیا، صبیحہ۔ کہا،
واہ! یہ خواب کی تعبیر ہے —— اُس کی زندگی میں کسی لڑکی کا یہ پہلا خط تھا،
بالکل پہلا، ایک غیر مانوس تجربہ رات ہو چکا تھا، بارہ گھنٹے کے وقفہ سے
یہ دوسرا ہوا، قوی تر، وہی جو زلزلہ میں چٹخی ہوئی عمارت کا حال ہوتا ہے،
وہی اس وقت ممتاز کی طبیعت کا ہوا —— بارے اُس نے خط پڑھا، وہی
طاہرہ والی درخواست کا اعادہ تھا، اور آخیر میں ایک تیز نوک تھی "جب
اور اثرات آپ پر کارگر نہ ہوئے، تو مروت کیا ہوگی، پھر بھی انہوں کی بات
اور ہے، سو بات مانی، ایک نہ سہی، مگر ایک اجنبی کی پہلی درخواست کی
لاج تو رکھ لیجئے . . . . . " ممتاز کو بڑی دقت پیش آئی، واقعی سخت مشکل،
ایسے موقع پر، اگر کبھی کسی کا ناجائز مطالبہ، رعایت اور مروت سے، بڑی

بڑی قربانی کرکے، پورا کردے، تو وہ بعد میں، اپنے محسن کا ممنون کم، اور اُس کے کیریکٹر سے متشبہ زیادہ ہوجاتا ہے۔ ممتاز کو بھی، اُس وقت، یہ بات نہ سوجھی، اور کیسے سوجھتی، دماغ تو مخمور تھا، پھر بھی جانے کیوں اُس نے صبیحہ کے خط ہی پر فوراً لکھ دیا — "خوشی، رنج، اور ندامت، انتہا طور پر، کبھی ایک ساتھ بھی ہوسکتی ہیں، یہ ایک نئی چیز آپ کے اس خط نے مجھے آج بتائی۔ خوشی اس کی کہ آپ نے مجھے اپنے اعتماد کا اتنا اہل سمجھا کہ بلا تکلف یہ تحریر بھیج دی، رنج اس کا کہ اپنا ضمیر آپ کے اس حکم کی تعمیل کی اجازت نہیں دیتا، اور ندامت اس پر کہ ایک دوشیزہ کی پہلی ہی بات رد کرنی پڑی۔ آپ کہیں گی اس جواب سے تو خاموشی بہتر تھی، مگر اول تو وہ اس سے بھی بڑی بداخلاقی ہوتی، دوم مجھے اپنی فروگذاشت کی معافی بھی تو آپ سے مانگنی تھی، امید ہے آپ میری معذوری کو حقیقی سمجھ کر مجھے معاف کردیں گی"

—— شام کو ممتاز کالج سے لوٹا، تو حشمت نے صبیحہ کا دوسرا خط دیا، کھولا، القاب پر نگاہ پڑی "محب معتمد" — بہت ہنسا، پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ اُس کا امتحان تھا، اُسے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ پاس ہوگیا۔ صبیحہ نے اُس کے اعتمادانہ کردار پر، غلو کے ساتھ، اپنی عقیدت اور مسرت کا اظہار اس خوبی سے، کیا تھا کہ، دبے الفاظ میں، اُس کی بھولی محبت کا بھی انکشاف ہورہا تھا، بہت لطیف، اور خفیف سا اشارہ، تھا بھی، یا نہیں، مگر ممتاز کو محسوس ہوا — دل ہی تو ہے، ایک نوجوان کا دل، بالکل کنوارا دل، صبیحہ کی یہ ادا ممتاز کو بھاگئی، بات اور گھات وقت کا معاملہ ہے۔ مال و دولت، ثروت و حشمت، حتیٰ کہ تاج و تخت بھی، آدمی ایک بار ٹھکرا سکتا ہے، مگر شباب میں، کسی دوشیزہ کی، سچی محبت کی تحریک رد کرنا مشکل،

بہت مشکل، بے انتہا مشکل ہے، تحریک ہونے، نہ ہونے کا سوال نہیں، محسوس کرنے کا ہے، ممتاز نے محسوس کی، اور یکبارگی اقرار محبت کر بیٹھا ـــــ پھر وہ تو مرد تھا، چھپے الفاظ کی اُسے کیا محتاجی، اُس نے حقیقت کو غلو کے انداز میں بیان کیا ـــــ صبیحہ بھی عام طرح کی لڑکی نہیں تھی، بولتی کم، مگر موقع پر خوب بولتی، اور پھر لکھنے میں تو شاید، عام عورتیں بھی، مردوں سے بازی لے جاتی ہیں ـــــ دوسرے روز اُس کا تیسرا خط آیا، یہ تھا اُس کا پہلا محبت نامہ اُس میں سبھی کچھ تو یکبارگی لکھ دیا گیا تھا، حتیٰ کہ یہ بھی کہ "میں خفیہ محبت کرنے والی لڑکیوں کو بڑی ذلیل نگاہ سے دیکھتی تھی، اور خود کو بہت ہی خوددار جانتی تھی، مگر مجھے ندامت ہے، افسوس نہیں، کہ اپنی قوت ارادی کے خلاف مجھے آج "خود بہ خود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا" کی صداقت کا قائل ہونا پڑا ...." اب کیا تھا، پابندی کے ساتھ خط و کتابت شروع ہو گئی ـــ ممتاز کو زیادہ بولنے، اور زیادہ لکھنے پر، عمدہ کھیلنے سے بھی، زیادہ غرہ تھا، مگر صبیحہ کے مقابلہ میں وہ غرہ ہی ثابت ہوا ـــــ صبیحہ کے خطوں کے اوراق ممتاز کو روز شکست دیتے رہے، یہ اور بات ہے کہ، اُس کی ہر شکست پر، اُس کا دل بڑھتا رہا، بات کچھ عجیب ہے، مگر عشق و محبت میں اس سے بھی عجیب تر باتیں ہوتی ہیں ـــ صبیحہ کے خطوط ایک کنواری کی سچی محبت کے آئینہ دار ہوتے، اُس میں ضبط، تکلف، تصنع، نام کو نہ ہوتا، اُس کے دل میں، بے تحاشہ جو جذبات محبت پیدا ہوتے، وہ بجنسہٖ اُسے سپرد قلم کر دیتی، ایسی باتیں بھی، جو ذہن میں تو آسکتی تھیں، مگر زبان سے کبھی ادا نہ ہو سکتی تھیں ـــ عورتوں کی کچھ فطرت ہی ایسی ہے، اور وہ اپنی وارفتگی میں مردوں کو بھی ایسا ہی سمجھ لیتی ہیں ـــــ مختصر یہ کہ صبیحہ محبت کے راستہ میں ممتاز سے ہمیشہ

پیش قدم رہی، وہ چل نہیں، دوڑ رہی تھی، ممتاز فیلڈ میں تو خوب دوڑتا تھا، مگر محبت کے میدان میں شاید مرد راستے کے نشیب و فراز غور کرنے میں، عورت سے پیچھے رہ ہی جاتا ہے —— آخر عقل ہر موقع پر کام بناتی ہی تو نہیں کبھی کبھی اس کی زیادتی وہم کی شکل بھی تو اختیار کر لیتی ہے —— ممتاز کے پیروں میں بھی عقل زنجیر بن کر پڑی رہی، مگر صبیحہ کے یہاں تو خالص محبت ہی محبت تھی، اسے دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہ آتا —— ہوا میں اڑنے والا کیا جانے کہ اتنی بلندی سے زمین پر گرنے میں جان جانے کا بھی خطرہ ہے، لیکن اگر وہ پہلے ہی یہ سوچ لے تو پھر اسے ہوا میں اڑنے کا لطف ہی کیا آئے گا —— بس وہ ایک محبت کی دنیا تھی، جس میں زمین پر تو ممتاز چل رہا تھا اور ہوا میں صبیحہ اُڑ رہی تھی —— جب یہ مراسم ان دونوں میں شروع ہوئے تو پردہ کی صورت مزید تبدیل ہو گئی، جب اور جہاں یہ دونوں اکٹھا ہوتے —— تو صبیحہ اس طور پر پس پردہ کھڑی ہوتی کہ وہ ایک دوسرے کو برابر دیکھتے رہتے، اور کوئی دوسرا ان دونوں کو آپس میں یوں غرق نہیں دیکھ پاتا، یا کم از کم وہ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے، یوں تو دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں، اور شاید آنکھ بھی —— مگر وہ ایسے موقع پر زبان کا کام اپنی آنکھوں سے لیتے، اور کبھی کبھی گونگوں کی طرح اپنی انگلیوں کے اشارے سے بھی، انہوں نے اپنے اس نئے طریقہ گفتگو میں بہت جلد مہارت حاصل کر لی، جیسے کوئی شخص ایک ہاتھ کٹ جانے پر، دوسرے ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیتا ہے —— صبیحہ اس وقت تو یہاں اپنے والد کے تبادلہ کے سلسلہ میں آ گئی تھی، مگر قمر اپنے چھوٹے بھائی سے صبیحہ کو اپنے بیٹے انور کے لئے کئی سال سے مانگ رہے تھے، اس میں ان کی اپنی مصلحت سے زیادہ

ان کے صاحبزادے کی پسند کی شدت کا دخل تھا، چچازاد بہن جو تھی۔ روز کی دیکھی بھالی، بس نظر میں کھب گئی ـــــ پھر شادی ہی تو کرنی تھی، خواہ مخواہ اس کے ستارِ دل کی آواز سننے کی کیوں کوشش کرتے، اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ لڑکی کی مرضی معلوم کئے بغیر شادی کرنی ہو، تو اجنبیت میں فائدہ ہے، جہاں واقفیت نہیں ہوتی، وہاں اُنس نہیں ہے، تو نفرت بھی نہیں، مگر جانے پہچانے ہوئے کی بات بالکل مختلف ہے۔ پسند یا ناپسند، مثبت یا منفی، کوئی نہ کوئی، جذبہ ضرور ہوگا ـــــ یہ صحیح ہے کہ لڑکیوں کی پسند عام طور پر دل ہی میں رہتی ہے۔ یا رہتی تھی ـــــ زبان پر کم ہی آتی ہے، مگر جب آتی ہے تو بے دھڑک آتی ہے ـــــ جو بھی صورت ہوئی، مگر ممتاز سے صبیحہ کے یہ روابط پیدا ہونے کے بعد انور کے پیغام کو صاف جواب ہو گیا۔ کوٹھی میں ایک خاموش ہلچل مچ گئی ـــــ انور کی امید اچانک ٹوٹی، درد تو لازمی تھا ـــــ محبت کسی قربانی سے نہیں ڈرتی، تو نفرت بھی کب انتقام سے چُوکتی ہے، عشق میں چاہے یادِ خدا باقی رہے، مگر طیش میں خوفِ خدا بہت کم ہی باقی رہتا ہے ـــــ اب انور نے صبیحہ کی رسوائی کی ٹھان لی، وہ اس کے خطوں کی ٹوہ میں پڑ گیا، جوئندہ یابندہ، محبوب کے خط خط تو ہوتے نہیں، وہ تو تعویذ ہوتے ہیں، ہزار چاہیئے، کیسے چاک کیجئے، کیسے جلایئے، ہاتھ ہاتھ ہی تو ہیں چپٹے تو نہیں ـــــ انور نے ممتاز کے ہوسٹل پارٹنر کو ملا کر، ایک روز اس کے بکس سے صبیحہ کا ایک خط نکال لیا ـــــ خط خط کی تو تخصیص تھی نہیں، وہاں تو ہر پرزہ میں کوزے میں دریا بند تھا ـــــ اس خط کو پہلے چاک کیا گیا (تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ کہیں پھٹا ہوا پڑا ملا ہے) اور پھر اس کے ٹکڑوں کو جوڑ کر صبیحہ کے والد کے یہاں پیش کیا گیا، ظاہر ہے یہ چیز ان کو مشتعل کرنے کے لئے

کافی تھی، مگر یہ دیکھ کر کہ پانی سر سے گذر چکا ہے، وہ خاموش ہو گئے، مگر اوروں کو تو خاموش کرنا اتنا آسان نہیں تھا ـــــ بدنامی تو بدنامی ہے، فروغ نہیں، جس پر کوئی خود خوش ہوتا ہے، اور دوسرے خواہ مخواہ جلتے ہیں، یہاں تو معاملہ برعکس ہے، آپ اپنی بدنامی پر خود روتے ہیں، اور دوسرے، آپ کو تسلی دینے کی شکل میں، اُس کی مزید تشہیر کرتے، اپنی سابقہ بدنامیوں کی چوٹ سہلاتے ہیں وہ لوگوں سے گویا یہ کہتے ہیں کہ یہ بدنامی میری بدنامی سے زیادہ بڑی ہے، اب آپ لوگ میری بھول جائیے، اور اِس نئی سے محظوظ ہوئیے ـــ صبیحہ کے والد کے نہ چاہنے کے باوجود، خاندان کی تسلی کے لئے، اس خط کی تحقیقات شروع ہوئی ـــــ صبیحہ سے پوچھا گیا "یہ خط تمہارا ہے؟" "میں اس سوال کا جواب بھی دینا اپنی توہین سمجھتی ہوں" کہہ کر وہ وہاں سے چل دی ـــ کر لو جواب کرنا ہو، ڈراتے تو لوگ ڈرنے والے ہی کو ہیں، خطرہ تو صرف محسوس کرنے کی چیز ہے، دل کڑا ہو، اور احساس مجرمانہ نہ ہو، تو کچھ بھی نہیں ـــ معاملہ رفع دفع ہو گیا ـــــ البتہ ممتاز نے جو یہ خبر سنی تو اُس کے حواس غائب، چور کا دل آدھا، وہ سخت اُلجھن میں پڑا، وہاں جاؤں، یا نہ جاؤں، خفت کہتی، نہ جاؤ ـــ دل کہتا، چلو، عقل کہتی، آج نہ بھی گئے تو کل جانا ہے، ابھی گئے، تو ملزم، رُک کر گئے تو مجرم، مفرور قیدی، کب تک، اور کہاں چھپے گا ـ آخر، وہ فیلڈ سے واپسی پر، حسب معمول، کوٹھی پر گیا ـــــ صبیحہ طاہرہ کے کمرہ میں، سنگاردان کے سامنے کھڑی، اپنے بال سنوار رہی تھی، یا ممتاز کی راہ دیکھ رہی تھی، اُس کی آواز سنتے ہی، برآمدہ میں جھانکی، دیکھا چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، فوراً تاڑ گئی ـــــ زبانی بات چیت تو یوں بھی کم ہوتی تھی، اس وقت اور بھی موقع نہیں تھا، مگر وہ تو، اب جیسے نفسیات کی

ماہر ہوتی جا رہی تھی، وہیں کھڑی کی کھڑی، ممتاز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، بے ساختہ ہنس پڑی، جیسے کہ، وہ کہیں اپنی بیوقوفی ہے، اچانک کائی پر پھسل کر گر پڑا ہو —— غریب پھسلا تو تھا ہی، آخر اُسی کی لاپروائی سے تو وہ خط نکلا" مگر اُس دل آویز ہنسی میں اُس کی بیوقوفی پر مضحکہ، اور اُس کی غلطی کی عفو، دونوں ہی تو تھیں —— پھر بھی ڈر تو ڈر ہے" آسانی سے کہاں نکلتا ہے"۔

ممتاز رات بھر بالکل نہ سو سکا، اُس کے دماغ میں جانے کیا کیا خیالات آتے رہے" لوگوں کی نگاہ میں ہم گیارہ گئے" صبیحہ نے اپنے دل میں ہمیں کیا سمجھا، کسی لڑکی کی محبت کا راز، اپنی غیر ذمہ داری سے، فاش کرنا، کوئی معمولی بات ہے" بات تو دراصل بڑی اہم ہے" مگر اہم تو سمجھنے ہی پر ہے" ورنہ صرف ایک بات ہے —— صبح ہوئی، صبیحہ کی ڈاک کا وقت قریب آیا، نہ جانے کیوں آج ممتاز کا جی چاہا کہ کوئی خط نہ آئے تو اچھا —— پرچے خراب ہو جائیں تو امیدوار کا دل تو یہی چاہتا ہے کہ نتیجہ آئے ہی نہ تو اچھا —— مگر خوف سے کہیں مصیبت ٹلتی ہے" وہ تو بہر حال اپنے وقت پر آتی ہے، ٹھیک وقت پر خط آ گیا، بلکہ آج کچھ پہلے ہی —— خفگی بھی تھی، اور شکایت بھی، مگر وہی ؎

"قربان اک نگاہ پہ لاکھوں بناوٹیں"

ممتاز کو یہ خط سب سے پیارا معلوم ہوا، کیوں نہ ہو، محبوب کی جھاڑ میں تو پیار سے زیادہ لذت ہوتی ہے، یک رنگی کسی شئے کی اچھی نہیں تو پیار کی کیوں ہو —— اُس نے لکھا "آپ اُس واقعہ سے پریشان ہیں، اور میں صرف آپ کی پریشانی سے، مہم سخت ہے، تو ہمت بھی تو بہت ہی رکھنی ہوگی، آپ یوں ڈریں گے تو یہ کشتی تو غرق آب ہو جائے گی، کھے تو میں شاید خود لوں گی، لیکن اگر اُس کا ناخدا نہ ہوا تو لگے گی یہ کس گھاٹ پر۔۔۔۔"

سچ ہے ڈر کا علاج تو ڈانٹ ہے، ممتاز کو فوراً سکون ہو گیا۔ شام کو وہ خوش خوش طاہرہ کے یہاں گیا، صبیحہ وہاں پہلے سے موجود تھی، آج وہ آنکھوں سے نہیں، زبان سے بات کرنا چاہتی تھی، یہ تو ڈاکٹر ہی جانتا ہے، کب اور کون سا اوزار استعمال کرنا چاہیے ——— ذرا سا موقع ملا، پوچھا "اب تو طبیعت ٹھیک ہے ناں؟" ——— "بھلا کسی عطائی کا نسخہ تھا، جو خطا کرتا" ممتاز نے مسکرا کر جواب دیا۔ صبیحہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "شکریہ، پرانا مریض بھی تو اپنے مرض کا ڈاکٹر بن جاتا ہے" ——— "مگر ہمارے اور آپ دونوں کے مرض کی مدت تو ایک ہی ہے" ممتاز نے طنز کی ——— "شدت میں جو فرق ہے، آپ مریض ہی رہے، میں ڈاکٹر ہو گئی" کہتی ہوئی وہ غائب ہو گئی ——— مگر وہ محبت ہی کیا جس میں ٹھوکر نہ لگے، اور ٹھوکر بھی ایسی کہ انسان قلا بازی کھا جائے، محبت اور دق، دونوں یکساں ہیں، گھلا گھلا کر مارتی ہیں ——— دشمن دشمن ہے، دشمنی سے ہارا، تو دوستی سے وار کرے گا، مگر وہ اپنی سعی کرے گا ضرور ———

انور نے ایک روز کوٹھی پر ہرن کے کباب کی دعوت کی، ممتاز کو بھی بلایا ——— ٹیڑھا سوال تھا، مالک خانہ کے صاحبزادے، اُن کی مرحومہ بیوی کے لاڈلے، وہاں پر روز کا آنا جانا، اُن کی دعوت سے گریز کرتا، سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنا تھا ——— ممتاز چلا گیا، دعوت میں خوش گپیاں تو ہوتی ہی ہیں، تک کی کم، بے تکی زیادہ، وہ ہوتی رہیں، تھوڑی دیر میں نزلہ ممتاز کی طرف رجوع ہوا ——— "کیوں ممتاز! بڑے دن کی تعطیل میں تم ایک روز بھی ہم لوگوں کے ساتھ شکار پر نہیں گئے؟" کسی نے چھیڑ کی ——— "فائنل قریب ہے، امتحان کی تیاری سے فرصت نہیں ملتی" ممتاز نے بات ٹالنے کی کوشش کی ——— "بھئی! جسے گھر پہ ہی شکار مل جائے، وہ بادیہ پیمائی کیوں کرے" ایک دم انور نے گفتگو کا

رُخ اپنے موضوع پر پھیر دیا ـــــ ممتاز کا ماتھا ٹھنکا، آج رنگ بے ڈھب ہے، کوئی گہری سازش ہے ـــ اُس نے پریشانی میں، ایک حسرت کی نگاہ، طاہرہ پر ڈالی وہ مسکرا دیں، اُس کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی، سوچنے لگا، کیا کروں، کیا نہ کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آیا ـــ اتنے میں کسی دوسرے صاحب نے لقمہ دیا "جو خود چشم غزالی کا گھایل ہو وہ بھلا ہرن کا کیا شکار کرے گا" ــــ اب ممتاز سمجھ گیا کہ آج میری خیر نہیں ہے، اُس نے جھٹ اُٹھنے کی کوشش کی، مگر انور نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا "اماں، چائے تو پی لو، اتنی بھی کیا جلدی!" ـــ ممتاز نے افسردگی سے معذرت کی، مجھے زکام ہے، سر میں درد ہو رہا ہے، میں ہوسٹل جا کر لیٹوں گا" ــــ زکام ہو یا نہ ہو، مگر اب اُس کے سر میں درد ضرور ہو رہا تھا ـــ مگر وہاں تو حیلے کے سب داؤں گویا پہلے سے مشق تھے ـــ کوئی اور صاحب مسکرا کر بولے "تو بھئی دو ایک روز کے لئے یہ ساری رات کی افسانہ نویسی ذرا ملتوی، ورنہ کم از کم مختصر کردو" ـــ اب ممتاز کے پیر تلے سے زمین تیزی سے سرکنے لگی، مگر جائے ماندن، نہ پائے رفتن، مرتا کیا نہ کرتا، اُس نے مجبوراً وہاں ٹھہر کر گفتگو کا رُخ پلٹنے کی کوشش کی "امتحان سر پر آگیا ہے، اس لئے رات کو زیادہ جگنا ہی پڑتا ہے" ـ ـــ "واہ، تم تو مقابلہ کے امتحان میں اول آچکے ہو، بی، اے کے امتحان کی کیا حقیقت ہے!" ـــ تڑ سے کسی نے گولی داغ دی ـــ ممتاز اب چکرا گیا، سوچا اب بھانڈا پھوٹ کر ہی رہے گا"، اور تو جو ہو سو ہو، یہ روز کی کوٹھی کی آمد و رفت بند ہوئی، اور اس حور شمائل سے، بس چلمن کی ملاقات بھی گئی ـ

ـــ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں طاہرہ کی طرف دوبارہ امداد طلب نگاہ سے تاکا ـــ مانا انور تمہارے سوتیلے بڑے بھائی ہیں، مگر میں تمہارا سگا خالہ زاد ہوں، تمہاری ہی تحریک پر میں یہاں آیا، تمہارے ہی پردہ میں میں،

اُس محبت کی جال میں پھنسنا" اب تمھیں بچاؤ — اور واقعی جیسے طاہرہ نے یہ سب کچھ ممتاز کی آنکھوں میں پڑھ لیا — اُس نے فوراً محسن کو کمرہ میں بلایا، وہاں میاں بیوی میں، زور زور سے، گفتگو ہونے لگی، برآمدہ میں اب ایک دم خاموشی ہوگئی، اندرا دے گرنے لگے، باہر بارش رک گئی —

طاہرہ تیزی سے بولی "آخر، یہ کیا لغویت ہے، کیا ممتاز کی اسی کی دعوت تھی؟" — محسن نے صبیحہ کی طرف مسکرا کر طاہرہ سے کہا "اُن کی دعوت تو ہو چکی، اب ہماری ان لیئے صفت سالی کی ہو رہی ہے — " مگر یہ کیوں؟"

طاہرہ کا پارہ چڑھنے لگا "آخر صبیحہ کا کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی قصور!" — "اچھا، تو کیا یہ محبت کی بدعت جرم نہیں ہے؟" محسن نے مذاق میں بیوی کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی — طاہرہ حیرت سے بولی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ بدعت ایک ارادی فعل ہے، محبت غیر شعوری، کیا آپ قدرتی نشوونما کو بھی روک دیں گے، کتنے خودرو پودوں کو آپ روز کچل دیتے ہیں، مگر کیا وہ پھر اُگ نہیں آتے؟" — محسن نے صبیحہ کا تمتایا ہوا چہرہ دیکھا، اپنی بیگم کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھیں، موقع کی نزاکت کا احساس کر کے بیوی سے تفریح شروع کر دی کہ ماحول سرد ہو، ہنس کے بولے "بھئی، میں شادی سے قبل کی محبت، اور رومانس کو بُرا نہیں کہتا —

ہم نے بھی کیا ہے عشق، مگر ایسا تو ہمارا حال نہ تھا

وہ ایک سوڈے واٹر کا جوش تھا، جو تمھاری جیسی حور طلعت کے آنے کے بعد ختم ہو گیا" — صبیحہ محسن کی یہ گفتگو سنتے ہی ایک دم بھڑک اُٹھی، اور فوراً کچھ کہنا چاہتی تھی کہ طاہرہ نے اُس کو گھور کر خاموش کر دیا، گو یا ہم اپنی، اور تمھاری، دونوں کی مدافعت خود کر لیں گے، تم ذرا صبر کرو —" مگر

آپ مرد، اور عورت کو، محبت کے معاملہ میں یکساں کیوں سمجھتے ہیں" طاہرہ نے محسن سے جرح کی ——— "اس لئے کہ دونوں ہی انسان ہیں" محسن یہ طنز کرکے کھلکھلا کر ہنسے کہ گویا ایسی چھوٹی اور صریح بات بھی جب تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تو عقل کی بات کیا سمجھو گی ——— "جب دونوں ہی انسان ہیں تو دونوں کی خواہشیں بھی تو یکساں ہوں گی، اور اس کی شدت بھی" اسی تیزی سے طاہرہ نے جواب دیا" اگر کسی شخص کی کوئی قوت معطل کردی جائے تو کیا وہ قدرتی طور پر دوسرے عضو میں منتقل نہیں ہو جائے گی ——— "ضرور ہو جائے گی" محسن کو اب خیال آیا کہ واقعتہً مردوں نے جو عورتوں کی زبان بندی کردی ہے تو ان کی یہ قوت کہیں اور تو منتقل ہو گئی ہو گی ———

"عورتیں زبان سے نہیں، دل سے محبت کرتی ہیں، اسی لئے اس میں بڑی پائیداری ہوتی ہے، آخر ان کے دل میں ان کی زبان کی بھی تو قوت آگئی ہے . . . ." طاہرہ نے محسن کو مرد اور عورتوں کی محبت کا فرق بتانے کی کوشش کی ——— "تو گویا اتنی ساری شادیاں، جو آئے دن عورتوں کی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں، وہ سب ناکامیاب ہیں!" محسن نے پھر قہقہہ لگایا ——— ابکی صبیحہ نے مسکرا کر ان کی ہنسی کا ساتھ دیا، شاید محسن کی سادہ لوحی پر اس کو بے ساختہ ہنسی آگئی تھی ——— وہ بولی "تو آپ اور کیا سمجھتے ہیں، کیا دین مہر کے چند سکۂ رائج الوقت میں جسم کے علاوہ دل کا بھی سودا ہو جاتا ہے؟" ——— طاہرہ کو خوف ہوا کہ کنواری ہے، کم سن ہے، محبت کی گھائل ہے، مشتعل ہے، جانے وہ اس وقت، نظیر میں، کس کس کا راز اگل دے ——— اس نے بیچ ہی میں بات ٹوک لی "ضروریات، رسومات، اتفاقات زندگی، اور والدین کی مصلحت، جس کو بھی عورت کا سرتاج بنادیں،

مجبوراً انسان کیا نہیں گوارا کر لیتا، متحمل تو جیل کی مدت بھی، شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن، صبر و شکر سے کاٹ لیتے ہیں"۔۔۔ محسن اور طاہرہ کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ انور نے دو چار سخت جملے صبیحہ پہ ذرا کھل کر کس دیئے، اُن کو اپنے دل کا غبار نکالنے کا اس سے اچھا موقع اور کب ملتا۔۔۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی تو ہو ہی رہی تھی، ترکی بہ ترکی جواب دے بیٹھی"۔۔۔ "جی ہاں میں اپنے دل کی مالک ہوں، میں ممتاز سے محبت کرتی ہوں" اور ڈنکے کی چوٹ پہ کرتی ہوں، بس۔ اب تو آپ لوگوں کو کچھ نہیں کہنا ہے!" کہنا تو اب لوگوں کو کچھ نہیں تھا، مگر اس دھماکے سے کوٹھی کی روایت کے بام و در ہل گئے" سارے کنبہ میں ایک تہلکہ مچ گیا، اس سے قبل اس کوٹھی میں سب کچھ ہوا تھا، مگر یہ بانگ دہل، اس طرح کا اعلان، کبھی نہیں ہوا تھا، اوروں نے چوری کی تھی، سینہ زوری کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی تھی"۔۔۔ دوسرے ہی دن طاہرہ اپنی سسرال چلی گئیں"۔۔۔ ممتاز نے کوٹھی پہ آنا جانا بالکل بند کر دیا۔۔۔ پھر بھی اُس دیوانی کا پیامبر، اُس کے خطوط لے کر، ممتاز کے پاس ہوسٹل میں پہنچتا رہا۔۔۔ ممتاز نے اس کو لکھا "دنیا کا کچھ خوف، اور اپنی زندگی کا کچھ خیال کرو، اور یہ سلسلہ اب بند کر دو۔ ۔ ۔ ۔" جواب آیا "مجھے اب کسی کا خوف نہیں ہے، آپ اپنا دل مضبوط رکھیں، اور جو میں نے کہا ہے جلد کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" صبیحہ کا ایک مشورہ تھا، دوسری ہدایت، مشورہ کو تو ممتاز ٹال گیا، مگر اُس کی ہدایت کے مطابق اپنی ماں کو رشتہ لے کر اُس کے والدین کے پاس بھیجا، اُنہوں نے معذرت کی کہ یہ کوٹھی اب دوسرا دھماکہ نہ سہہ سکے گی، بیٹھ جائے گی ممکن ہے صبیحہ کا سہاگ بھی لٹ جائے، اور آپ گویا دوبارہ بیوہ ہو جائیں۔۔۔ ممتاز کی ماں کے دماغ میں یہ بات جم گئی، اور وہ خاموش

لوٹ گئیں۔ اور ممتاز سے کہا کہ صبیحہ کے والدین طوفان گذر جانے کا انتظار کر رہے ہیں ــــ اور یہ بات غالباً صحیح بھی تھی ــــ مگر وہ دیوانی معاملات کو ٹھنڈا ہونے ہی کب دیتی تھی، وہ تو جلتے پر تیل ڈالتی جا رہی تھی، خطوط کی آمدورفت جاری تھی، اُسی کے ساتھ کنبہ والوں کی ضد بھی بڑھ رہی تھی ــــ تنہا اُس کے والدین غریب کیا کرتے، کنبہ کی روایت توڑنا آسان تو نہیں تھا، شادی شادی ہے، غم تو نہیں، جو آپ تنہا کھالیں، خوشی کا معاملہ تو سارے کنبہ کی مرضی کے تابع ہے ــــ مگر عورت کی ضد بھی تو اپنی ایک روایت رکھتی ہے۔ بچہ جیسے اپنی جان پر کھیل گئی، لوگ راضی ہوں، تو خیر، نہیں ہوتے، نہ سہی، ہم تو اپنا فیصلہ کر چکی ــــ ممتاز نے اُس کو تمام نشیب و فراز خوب سمجھائے، بدنامی کا خدشہ، کنبہ کے چھوٹنے کا خطرہ، زندگی کی بے سروسامانی ــــ مگر اُس کی گرویدگی ان باتوں پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تھی، اُس کے دماغ میں اپنے خاندان کا کوئی پرانا واقعہ یاد تھا، اور وہ اس پر جلد سے جلد عمل کرنا چاہتی تھی، ــــ مگر ممتاز دل سے زیادہ، دماغ سے کام لے رہا تھا، اُس نے سوچا اپنے پھیر پھیر کھڑے ہونے سے قبل اُس کا ہاتھ کیسے پکڑے، ایسی دلیر، خوددار، وفا شعار، لڑکی کی سماجی حیثیت کو کیوں کر مجروح ہونے دے، اُس کو اپنی دشواریوں سے زیادہ صبیحہ کی رسوائی کا خوف تھا ــــ اُس نے اُس کو پھر سمجھایا "تم اس وقت محبت اور طیش میں دیوانی ہو رہی ہو" اور یہ نہیں سوچتیں کہ تم ایک آبدار موتی ہو، میں اپنی جان قربان کر دوں گا، مگر اس موتی کی آب نہیں اُترنے دوں گا۔ ۔ ۔"

مرد عورت کو جیب تو کر ہی لیتا ہے، محبت کو فن جو سمجھتا ہے ــــ صبیحہ کا اصرار جاری رہا، خط پر خط آتے رہے، تاکید پر تاکید ہوتی رہی، ممتاز اُس کو برابر تسلی دیتا رہا۔ اسی دوران میں اُس کے امتحانات ختم ہو گئے، اور اب وہ

اپنے گھر روانہ ہونے کے لئے، مہینوں کے بعد کوٹھی پر سب سے ملنے کے لئے آیا۔ سب سے نپٹ کر۔ آخر میں رخصتی سلام کرنے صبیحہ کی والدہ کے پاس گیا، وہ بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ اُن کے دل میں کیا تھا، یہ تو نہیں معلوم، مگر اُن کا سلوک ایسا ہی تھا جیسا کسی ماں کا اپنی بیٹی کے پرستار کے ساتھ ہوتا ہے۔ سچ ہے، ایک ماں کو ہی تو بیٹی کے دل کے درد کا صحیح احساس ہوتا ہے، مگر ہیں تو دونوں ہی عورت، آخر مرد کے قبضہ میں —— انہوں نے بڑے پیار سے کہا "ممتاز میاں! یہاں سے جاکر ہم لوگوں کو بھول نہ جانا، کبھی کبھی آنا ضرور ....." —— ممتاز کی زبان سے برجستہ نکلا۔ "آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر میری زندگی کو تو ایسی پریشانی لاحق ہے کہ ممکن ہے یہی میری آخری ملاقات ہو..." ممتاز کے اس فقرہ پر وہ چیں بہ جبیں ہوئیں "ایک نوجوان کو مشکل ترین حالات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے، انتہائی ناامیدی کی صورت میں بھی اللہ امید کی شکل پیدا کر دیتا ہے، صرف طلب صادق شرط ہے ...." —— یہ کہہ کر وہ اچانک اٹھیں اور چائے لانے کا عذر کرکے وہاں سے چلی گئیں، اور وقت اتنا لیا جیسے چائے نہیں کھانے کا انتظام کر رہی ہیں، اس طور پر شاید وہ صبیحہ کو ممتاز سے کھُل کر گفتگو کرنے کا موقع دے رہی تھیں۔ ممتاز نے مہینوں سے صبیحہ کو دیکھا نہیں تھا، خط ضرور جاتے تھے، مگر اس میں تو اس کا عکس ہی نظر آتا تھا، ممتاز کی آنکھیں تو اس ماہتاب کی دید ہی سے سکون پاتی تھیں —— اس وقت وہ سامنے کمرہ میں، ممتاز کی نگاہ کی ٹھیک زد میں، سرنگوں بیٹھی تھی، دروازہ کا ایک پٹ بھڑا ہوا تھا، چوکھٹ کے سرے پر نارنجی بلب لٹک رہا تھا، اس کی دلکش روشنی میں صبیحہ کا بھولا، معصوم چہرہ، کھِلا ہوا کنول معلوم ہو رہا تھا، ممتاز نے، تخلیہ پا کر،

دوسرا پٹ بھی آہستہ سے کھول دیا، دیکھا تو اس کی نرگسی آنکھوں سے گنگا اور جمنا بہہ رہی تھی، یہاں ممتاز کے دل میں بھی تو سرسوتی ہلکورے مار رہی تھی، اور اس کا سینہ پھٹ رہا تھا ـــــ عورتوں کو ہزار مجبوری سہی، وہ کھل کر رو تو لیتی ہیں، دل کا بار کچھ تو ہلکا ہو جاتا ہے، مردوں کے لئے تو ؎

گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

کی سخت پابندی ہے ـــ ممتاز نے اپنے آپ کو ضبط کر کے صبیحہ کو چھیڑنے کی کوشش کی "کیوں صاحب! ہمت والوں کی یہی شان ہے؟" دفعتہً صبیحہ کی گردن کو جنبش ہوئی، اُسنے اپنے آنسوؤں سے تر چہرہ کو اوپر اٹھایا، اور گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "دل کا بند ہی ٹوٹ جائے تو آنسوؤں کے سیلاب کو کون روکے!" اس وقت صبیحہ کی شہلائی آنکھوں میں ساری دنیا کی حسرت سمٹ آئی تھی، اس سے آنکھیں چار ہونے کے بعد، ممتاز نے محسوس کیا جیسے اس کی چشم فسوں ساز کے ذریعہ کوئی مخدر چیز اس کے دماغ پر چڑھ رہی ہے، اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی، مگر جانے صبیحہ کی اس ایک نگاہ میں کیا تاثیر تھی کہ وہ بالکل بے تاب ہو گیا، آنسو تو اس نے پی لئے، جیسے زہر قاتل، اندر اس کا سارا سینہ سلگ اٹھا۔ مرد کی بھی کیا زندگی ہے، دوسروں کو ہی نہیں، خود اپنے آپ کو بھی تو دھوکہ دیتا رہتا ہے۔ ممتاز نے صبیحہ کو، اور شاید خود اپنے کو بھی تسلی دینے کی کوشش کی "تم اطمینان رکھو، تم مجھ کو نہیں چھوڑنا چاہتیں تو میں بھی تم کو نہیں چھوڑوں گا خواہ میری جان ہی پر کیوں نہ بن جائے" ایک کنواری لڑکی کا دل بھی کتنا معصوم ہوتا ہے، وہ وفا کی دیوی، ممتاز کے اس ایک فقرہ پر آنسوؤں کی جھڑی میں بھی یکبارگی زیر لب مسکرا اٹھی جیسے ساون کی دھواں دھار بارش میں یکایک بجلی چمک جائے، آنکھوں میں موتی، لبوں پر مسکراہٹ، ہنس کر بولی "آپ صرف اس عہد پر قائم رہیں تو دنیا میں

کوئی ایسی طاقت نہیں، جو آپ کو مجھ سے چھڑا دے، موت چھڑا دے تو اور بات ہے۔۔۔۔۔" یہ تھی صبیحہ کی آخیر ہنسی، یہ تھی صبیحہ کی آخیر گفتگو، یہ تھی صبیحہ کی آخیر جھلک، جو ممتاز کی آنکھوں نے دیکھی، جو ممتاز کے کانوں نے سُنی، جو ممتاز کے دل پہ منعکس ہوئی — ممتاز صبح کو اسٹیشن کے لئے روانہ ہو رہا تھا کہ صبیحہ کا آخیر خط ملا — اُس نے لکھا "آپ جا رہے ہیں، میری ایک بات سنتے جائیں، مجھے آپ کی محبت کا پورا یقین ہے، مگر مجھے آپ کی مصلحت اندیشی سے ڈر لگتا ہے، آپ علامہ اقبال کا یہ قول یاد رکھیں ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

آپ کی اور میری زندگیاں، روحانی طور پہ، اب اس طرح ایک ہو چکی ہیں، کہ ان کو، اگر کسی وجہ سے، دو راستوں پہ چلنا پڑا، تو یہ دونوں برباد ہو جائیں گی، زندگی ہے تو زندہ رہیں گے، انسان نہیں، مشین بن کر۔۔۔۔۔"

امتحانات کے نتیجے شائع ہوئے، ممتاز کامیاب ہو گیا، اول درجہ تو ملنا ہی تھا، کوئی خاص مقصد زندگی سامنے ہو تو جذبۂ عمل بھی تو قوی تر ہو جاتا ہے، پھر دل میں سچی محبت کی لہر دوڑ رہی ہو تو دماغ بجلی کی طرح کیوں نہ کام کرے — صبیحہ ایک بڑے رئیس کی بیٹی تھی، وہاں اہلیت کا معیار امارت تھا، اور ممتاز کو اپنے باپ سے صرف علم کی وراثت ملی تھی، اُس نے بھی وہی دولت اکٹھا کر کے صبیحہ کو حاصل کرنے کا خواب دیکھا، صبیحہ ممتاز کے حسن پہ، اس کے علم پر، اُس کی ذہانت پہ، اُس کی خوش خلقی پہ، یا کسی اور خوبی پہ، جو صرف اس نے محسوس کی، اس کی گرویدہ ہو گئی تھی — مگر ممتاز تو اُس کی بے پایاں محبت کی سبقت پہ بری طرح ریجھ گیا تھا، ایک وقت

تھا جب کہ، اُس کی نگاہ میں، اپنے حسن کے مقابلہ میں، کوئی لڑکی نہیں کھپتی تھی، اور اب صبیحہ کی مثل اُس کو کوئی دوسری لڑکی نظر نہیں آتی تھی، اُس کی خامیاں بھی اب اُس کی خوبیاں معلوم ہونے لگی تھیں ـــــ ممتاز کی بیوہ ماں، جس کی زندگی کا اب وہی سہارا تھا، اُس کی یہ دیوانگی دیکھکر بہت پریشان ہوئی، پُرانے خیال کی خاتون، خود کم عمری کی بیوہ، اُس کی سمجھ میں ممتاز کی سراسیمگی کا واحد علاج شادی نظر آیا ـــــ صبیحہ کے یہاں سے تو وہ مایوس ہو چکی تھی، اور یوں بھی وہاں رشتہ کر کے ممتاز کو انور کا کشتۂ ستم نہیں بنانا چاہتی تھی، ـــــ وہ معمولی پڑھی لکھی خاتون تھی، اُس نے سوچا مثالی دوا نہ ملنے کی صورت میں خانہ ساز دواؤں سے بھی تو کام چل جاتا ہے، کچھ کو عطائی علاج سے بھی فائدہ ہو جاتا ہے، اور بعض تو صرف دعا تعویذ سے ہی شفایاب ہو جاتے ہیں ـــــ اُس کا علم زیادہ تر ذاتی تجربات اور مشاہدات تک محدود تھا، وہ خود حسن کے معاملہ میں بے شک ممتاز کی ماں تھی، انتہائی حسین، پھر بھی اُس کے مرحوم شوہر اپنی سانولی سلونی ماما سے دل بہلانے سے نہیں چوکتے تھے۔ اُس کے خیال میں محبت ہسٹریا کی قسم کا ایک عارضہ ہے، جو عورتوں ہی کو نہیں، مردوں کو بھی ہوتا ہے، اور شادی ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے ـــــ بس وہ بات کی بات میں، ایک تقریب میں، ایک لڑکی کو پسند کر کے، انگوٹھی پہنا آئیں، ممتاز کو اُس کا کوئی علم نہیں ہوا، کیوں ہوتا؟ شادی تھی، کوئی کپڑے اور جوتے تو نہیں خریدنے تھے، جو اُس سے پسند کرائے جاتے۔ شادی ایک معاشرتی مسئلہ ہے، اُس میں محبت کا کیا دخل، علم علم کے لئے ہے، کسب معاش کے لئے نہیں، اسی طرح محبت محبت کے لئے ہے، شادی کے لئے نہیں ـــــ ملازمت جیسی ملے، پکڑ لو، قدرت اُس میں ترقی کی صورت پیدا کر دے گی،

شادی جیسی بھی ہو، کرلو — قدرت اُس میں نباہ کی صورت پیدا کردے گی — دوا دوا ہے، غذا تو نہیں، جس میں پسند، ناپسند کا سوال ہو، سوسائٹی کے مقررہ اصول ہیں، وہ اُس پہ چلتی رہی ہے، چل رہی ہے، اور چلتی رہے گی، جو اُس کا راستہ کاٹنے کی کوشش کرے گا، خود کٹ جائے گا —— آدمی قدم قدم پہ مجبور ہے، عورت ہو، یا مرد، حالات کے اختلافات کے ساتھ صرف اُس کی شکل بدلتی رہتی ہے، —— شادی میں ماں کا بھی تو بڑا حق ہے، اُس کے پیر تلے جنت جو ہے، اور بیوہ ماں، وہ تو ماں باپ دونوں ہے، اُس کی خوشی ہر چیز پہ مقدم ہے، جس کو یہ حق حاصل ہے اُس کے مطالبات بھی تو اُتنے ہی سخت ہوں گے، اور کیوں نہ ہوں؟ ماں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کبھی وزن کا خیال کیا ہے، جو حقوق کی وصولی میں کرے، زندگی تو لین دین ہے، پیدائش سے موت تک، حساب دل میں ہو، یا بہی کھاتے میں، ہر سلوک ایک دین ہے، جس کو منافع کے ساتھ، ایک روز، واپس کرنا ہے، نادہندوں کا ذکر نہیں، فرض شناس کے لئے یہ مجبوری ہے۔ جو ساہوکار جس فراغ دستی سے دیتا ہے، اتنے ہی سخت گیری سے وصول کرتا ہے — والدین کیا ہیں، وہ بھی تو ایک قسم کے، بلکہ بہت بڑے قسم کے، ساہوکار ہی تو ہیں، جو پیدائش سے جوانی تک بے دریغ قرض دیتے رہتے ہیں، اکثر اپنی ذاتی ضروریات اور خواہشات کو قربان کرکے — اب لڑکے کی حیثیت اُن کے مقابلہ میں کیا ہوئی، ایک مقروض ہی کی تو! — ایک دوشیزہ محبت پر جان دیتی ہے، تو دوسری سن رسیدہ اپنی زبان پہ بھی تو جان دینے کو تیار ہے، عورت کی تو ہر آن پہ جان ہے، مگر اس میں اُس کی کوئی زیادتی نہیں ہے، جو سلوک اُس کے ساتھ ہوا ہے، وہی تو وہ اپنے بچوں کے ساتھ کرے گی، اُس نے اپنی شادی کب اپنی مرضی سے کی، جو اپنے بچوں کو اُس کی اجازت دے، لقمان نے صرف یہی تو

کہا تھا کہ ؎ آنچہ بر خود نہ پسندی بہ دیگراں پسند — جو چیز اُس نے بے چون و چرا، گوارا کرلی، وہ اُس کے بچے کیوں نہ کریں — آخر، اس کو کوئی شادی کرنے کا تو حق ہونا چاہیئے، اپنی، یا اپنے بچوں کی، وہ جنریشن گیپ کی مصلحت نہیں سمجھ سکتی، وہ تو صرف یہ جانتی ہے کہ اُس کے والدین نے اُس کو یہ حق نہیں دیا، اسی لیئے اُس کو اپنے بچوں کو بھی یہ حق نہیں دینا ہے، یہ اُس کی سمجھ کے مطابق صاف اور سیدھی منطق ہے —— ممتاز کو جب ماں کے اس فیصلہ کی خبر ہوئی تو وہ بہت پھڑپھڑایا، مگر پنجرا سخت تھا، اور گرفت بہت مضبوط، اُس کے بازو شل ہوگئے، لیکن وہ اُڑ نہ سکا —— حکومت حکومت ہے، ملک کی ہو، یا گھر کی، سربراہ عورت ہو، یا فوجی جنرل، اُس کے خلاف بغاوت کرنا آسان نہیں، سینکڑوں، ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں، کوئی کوئی کرتا ہے پہلے ہی تناسب تھا، اب کچھ زیادہ ہوگیا ہے —— ممتاز کو یہ امتیاز حاصل نہیں تھا، وہ پھڑپھڑاتا ہی رہا، اور زنجیر اُس کے پیر، بلکہ گلے میں پڑ گئی — پھر زنجیر ہی تو تھی، وہ قیدی کی مرضی، اور اجازت سے، کب ڈالی جاتی ہے — اس خبر کو سن کر صبیحہ کا کیا حال ہوا، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے، ہم جس بات کو سمجھتے، اور سوچنے سے گھبراتے ہیں، وہ اللہ کے علم اور مرضی کے سپرد کر دیتے ہیں، اس طرح ہر اپنے ضمیر کو تھوڑی تسکین دے لیتے ہیں —— کچھ عرصہ کے بعد پتہ چلا مری نہیں، صرف تارک بستر ہوگئی، یہاں ممتاز کے گلے میں ایک دوسری بندھ گئی، گویا اُس کا ہاتھ دو کنواریوں کے خون ناحق سے رنگ گیا، مگر ممتاز کو اس سے کیا خطرہ، قانون مردوں ہی کے بنائے ہوئے تو ہیں، اُس میں چھری چلانا بے شک جرم ہے، مگر صرف جسم ہی پر تو، روح پر تو نہیں، وہ تو غیر فانی ہے، انصاف اندھا ہے، محبت اندھی ہے، تو وہ بھی کیوں نہ ہو۔

ایک مدت کے بعد اچانک ممتاز کی ملاقات اپنے ایک پرانے دوست اور ہم سبق رفیق سے ہوئی، بہت دیر تک ایک دوسرے کی سنتے سناتے رہے، شکوے شکایات ہوئے، بیوی بچوں کے حالات پوچھے گئے، صبیحہ کا بھی ذکر آیا، اُس کا نام آتے ہی ممتاز کی آنکھیں اُمڈ آئیں، آنکھیں آنکھیں ہیں، دل تو نہیں، جس کا درد آپ چھپالیں، وہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیتی ہیں، کچھ تکلیف تزئین میں بھی تو فرق ہوتا ہے، کچھ تکلیفوں کو یاد کرنے ہی میں غیر شعوری طور پہ سکون ملتا ہے۔ جیسے کوئی بیوہ عورت اپنے مرحوم شوہر کا، ساری عمر، موقع بے موقع، ذکر کر کے آنسو بہاتی ہے، بظاہر تو وہ روتی ہے، مگر حقیقتاً وہ اپنے سہاگ کے سہانے دنوں کو یاد کر کے ایک قسم کا حظ محسوس کرتی ہے ——— ممتاز نے افسردگی سے کہا "بیوی بھی ہے، بچے بھی ہیں، مگر ایک صبیحہ کا نہ ہونا، سب ہونے، نہ ہونے کے برابر ہے" ——— "ہونا نہ ہونا واقعی احساس ہی کی تو بات ہے، مانو تو بُت، نہیں تو پتھر" رفیق نے ایک تاثر کے ساتھ ممتاز کے خیال کی تائید کی ——— "واللہ، صبیحہ نے اپنے آخیر خط میں کتنی سچی بات کہی تھی" ممتاز نے عقیدتمندانہ طور پر اقرار کیا "آج دراصل، میری زندگی، بغیر اُس کے ایک مشین بن کر رہ گئی ہے، زندگی ہے، جی رہا ہوں، کوئی اُمنگ، کوئی حوصلہ، کوئی دلچسپی نہیں، دن رات صرف خشک واقعات، اور تکلیف دہ ذمہ داریوں سے سروکار ہے، اور اپنے ضمیر میں جرم کی ایک مستقل ٹیس محسوس کرتا رہتا ہوں، یہ زندگی مشین نہیں تو اور کیا ہے" ——— "مرضیٔ مولا، از ہمہ اولےٰ" رفیق نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی "تسلیم و رضا علم و عقل کا مطالبہ ہے، اور سے

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

"جی، بالکل وہی کر رہا ہوں" ممتاز نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا "اُس ماہ وش کی یاد، امرت کی بوند کی طرح، میری روح کی آبیاری کر رہی ہے ——— "صبیحہ کا بھی کچھ پتہ ہے" رفیق نے یک بہ یک گفتگو کا رُخ بدلا "وہ اب کہاں ہے، کس حال میں ہے؟" ——— "ماشاءاللہ زندہ ہے، تندرست ہے، بال بچوں والی ہے" ممتاز نے اضطراری طور پہ اُس کے حالات بتانے شروع کیے۔ "دنیا والوں نے اُس کے دل کو کچل دیا، مگر اللہ نے اُس کو نعم البدل دیا ——— پھر اللہ تو جب دیتا ہے، خوب ہی دیتا ہے، وہ مل مل کر دنیا کیا جانے" دیا تو دونوں ہاتھوں سے، لیا تو ایک دم ـ اُسے رئیس شوہر ملا، کثیر دولت ملی، متعدد اولاد ہوئیں، مگر اُس کو دلی راحت بھی ملی، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے...."

——— "ممتاز میں نے تمہاری محبت کا راز بہت دنوں تک اپنے دل میں رکھا ہے" رفیق نے ملتجیانہ انداز میں کہا "مگر یہ تو محبت کا ایک خزانہ ہے، قارون نہ بنو، اسے دنیا کو بانٹ دو، کچھ لوگ لطف، کچھ تفریح، کچھ عبرت حاصل کریں گے، تم یہ کام خود نہیں کر سکتے، تو میں حاضر ہوں، تم صرف مجھے اس کی اجازت دیدو"

——— ممتاز یہ سن کر بالکل خاموش ہو گیا، کچھ غور کرنے لگا، غور کرنے کی تو اُس کی پُرانی عادت تھی، اسی میں تو اُس نے صبیحہ کو بھی کھویا ——— اُس نے بڑے تاثر سے رفیق کو جواب دیا "تم ہم دونوں کی اس لافانی داستان کو، اپنے پرچہ میں، افسانہ بنا کر شائع کرنا چاہتے ہو، تو تم بھی اپنے دل کی کر لو، ممکن ہے، اس طرح، میری آرزو بھی کسی اتفاق سے پوری ہو جائے" ——— "وہ کیا؟" رفیق نے حیرت ظاہر کی ——— "آخر صبیحہ میرے دل کی مالکہ، بلکہ ملکہ ہے، ممکن ہے، وہ اپنے مراحم خسروانہ سے، اپنی محبت کے اس پشیمان قاتل کو، عفو بخش دے" ممتاز نے انتہائی حسرت و یاس سے، گلوگیر آواز میں کہا "یوں تو میں، اپنی

بے وفائی کے جرم میں، حبس دوام کی سزا بھگت رہی رہا ہوں، مگر اس میں
اُس کا کیا قصور، یہ تو از ماست کہ بر ماست ـــــ

پشیمان کو معافی

(قسط دوم)

ٹرین کے ایک زنانہ ڈبہ میں، شادی کی ایک پارٹی سفر کر رہی تھی، خواتین دنیا جہان کی گفتگو میں مصروف تھیں ـــ ہوش ربا گرانی، ملکی سیاست گھریلو تنازعات ـــ موضوع کی نہ قید تھی، نہ کمی ـــ ایک اسٹیشن پر ٹرین رُکی، اور اس ڈبہ میں، ایک ماڈرن قسم کی خاتون، بڑے تزک و احتشام کے ساتھ داخل ہوئیں، اُن کے ہاتھ میں ایک دیدہ زیب ماہ نامہ بھی تھا ـــ وہ بیٹھتے ہی ان خواتین کی گفتگو میں ماڈریٹر کی ذمہ داری انجام دینے لگیں، اور ایک نوعمر خاتون نے اُن سے اُن کا پرچہ لے لیا۔ باری باری، دوسری خواتین بھی اس کی ورق گردانی کرنے لگیں، ایک اُس پرچہ میں غرق ہوتی، اور بقیہ اپنے اپنے دکھڑے، ایک دوسرے سے، بیان کرنے لگتیں ـــ کسی نے کہا دو گرانی مارے ڈال رہی ہے، سپید پوشی کا بھرم رکھنا دشوار ہو رہا ہے“ ـــ دوسری نے فوراً گرانی کے حدود ملکی سیاست سے ملا کر،

اپنی ہرزہ سرائی شروع کردی، درمیان میں تیسری بول پڑیں "مجھے تو تقسیم ملک نے دربدر کردیا ہے ؎

چین گھر میں ہے، نہ جنگل میں اماں ملتی ہے ؛ دیکھیے قبر مسافر کو کہاں ملتی ہے"

— چوتھی نے جواباً اپنی روداد غم بیان کرنا شروع کردی "بی بی! میں تو اپنے گھر ہی میں بیٹھی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئی ہوں، بڑی بیٹی کی شادی کا سوال درپیش ہے، اللہ نے اُس کو چندے آفتاب، چندے ماہتاب بنایا ہے، اُس کے ان گنت رشتے آرہے ہیں، مگر جس نوجوان کو اُس نے پسند کیا ہے وہ پاکستان نیوی میں ہے، اول تو اُس کا شادی کے لئے یہاں آنا ہی دشوار ہے، لندن جاکر شادی کرنی ہوئی، اُس کے بعد بچی کو زندگی بھر کے لئے دیس نکالا دینا ہے — کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں، نہ گھر چھوڑا جاتا ہے، اور نہ وہ چھوڑتے بنتی ہے" — "اچھا، تو آپ شادی میں، لڑکی کی مرضی کی، اس قدر قائل ہیں!" ماڈرن خاتون نے اظہار حیرت کیا — "کیوں نہ ہوں، وہ بھی تو آخر انسان ہے، ہوش مند، تعلیم یافتہ لڑکی ہے، بے زبان جانور تو نہیں، غلام بیچنا، اور خریدنا جرم ہے، اور لڑکی کو اُس کی مرضی کے خلاف بیاہنا جرم نہیں، یہ کون سا انصاف ہے!" — "انصاف تو یہ بالکل نہیں، مگر اس برصغیر میں، خصوصاً مسلم معاشرہ میں، تو اب تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے" ماڈرن خاتون نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی — "جی ہاں" وہ خاتون بولیں "آپ صحیح کہہ رہی ہیں، مگر شاید آپ کو نہیں معلوم کہ اسلام نے عورت کو اپنا شریک زندگی چننے کی جتنی آزادی دی ہے اُس سے زائد ممکن نہیں ہے، مگر اب اس کا جواب کیا کہ، ہندو معاشرے سے متاثر ہو کر، اس حق کو صرف رسمی "ہوں" "ہاں" — "اوں" — یا صرف گردن کی جنبش میں تبدیل کردیا گیا ہے" — "مرد، عورت، بچے، بوڑھے،

اپنے اپنے دوست، اپنے اپنے مذاق کے مطابق، خود چنتے ہیں، اور اپنی زندگی کا ساتھی، ساری زندگی کا ساتھی، جو بہترین دوست ہے، اُس کا انتخاب گویا لاٹری کے ذریعہ ہوتا ہے، اس سے بڑا ظلم بھی کسی انسان کے ساتھ ہو سکتا ہے" ماڈرن خاتون نے بھی اُن کے خیال کی تائید کی ——— "ظلم کی نہ پوچھئے" شاید انسان کی فطرت ہی ظالم ہے، وہی لڑکے اور لڑکیاں، جو اپنی شادی میں، اس حق کے طلبگار ہوتے ہیں، خود ماں باپ بن کر، اپنے بچوں کو اس حق سے محروم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے، بلکہ قیدی وارڈن کی طرح کچھ زیادہ ہی سخت گیر ہوتے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ ایک ہی ماں باپ کے بچوں کی کھانے پینے کی پسند بھی، اپنی اپنی مختلف ہوتی ہے، کوئی میٹھے کا رسیا ہے، کوئی نمکین پر جان دیتا ہے، پھر دلی ارتباط کا سوال تو بہت ہی اہم ہے ؎

پسند اپنی اپنی، نظر اپنی اپنی" افسردہ خاتون نے اپنے خیال کی مزید تشریح کی ——— پھر دوسرا اسٹیشن آ گیا، لوگ اُترنے چڑھنے لگے، ماڈرن خاتون اب کسی نئے آنے والی سے مصروف گفتگو ہو گئیں ——— اور افسردہ خاتون اس پرچہ کو دیکھنے لگیں، پرچہ پڑھ کر اُنہوں نے آہستہ سے رکھ دیا، خاموشی سے سر کھڑکی سے باہر نکالا، آنکھوں سے عینک اتاری، اور رومال سے آنکھیں خشک کیں، باس کے باوجود آنسو نہیں تھمے ——— دوسری خواتین اُن کی یہ صورت دیکھ کر، اُن سے اس رقت کی وجہ پوچھنے لگیں، ماڈرن خاتون بھی اُن سے مخاطب ہوئیں "کیا اس پرچہ کے کسی افسانے نے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے، آپ بڑی حساس معلوم ہوتی ہیں، افسانہ افسانہ ہوتا ہے، اُس پر حقیقت کا گمان نہیں کرنا چاہیئے" ——— "آپ صحیح کہتی ہیں، مگر کبھی کبھی زندگی افسانہ بن جاتی ہے، اور افسانہ زندگی" اُنہوں نے

آنسوؤں کو پینے کی کوشش کی ——— "تو کیا اس میں کوئی افسانہ آپ کی زندگی کی سرگذشت سے اتنا موافق ہے؟" ——— ماڈرن خاتون نے صراحت چاہی ———

"جی، موافق ہی نہیں، یہ خود میری سرگذشت ہے!" وہ ایک دم بول پڑیں۔

——— "تو گویا افسانہ نگار نے، اس واقعہ پر افسانوی رنگ بھر دیا ہے؟" ماڈرن خاتون نے مزید تصدیق چاہی ——— "کسی رنگین تصویر پہ کوئی اور رنگ کیا بھرے گا، البتہ افسانہ نگار نے، بہت سی نہ کہنے والی باتیں بھی بڑی خوبی سے، اس افسانہ میں کہہ دی ہیں" یہ کہہ کر وہ بالکل خاموش ہوگئیں۔ اور ماڈرن خاتون اپنا پرچہ اُٹھا کر، جگہ جگہ سے افسانوں کو دیکھنے لگیں — اور پھر اُن سے مخاطب ہوئیں "آپ کا منشاء شاید "پشیمان" سے ہے؟" ———

"جی ہاں، اُسی زود پشیمان سے" وہ دبی زبان سے اقرار کر کے، پھر کھڑکی کے باہر، فضا میں تاکنے لگیں ——— ماڈرن خاتون نے اُس افسانہ کو تیزی سے پڑھنا شروع کر دیا، اور اُس کو ختم کر کے، وہ افسردہ خاتون کے پاس آئیں، اور بولیں "تو آپ صبیحہ ہیں؟" ——— "جی ہاں، بس یہی سمجھ لیجئے" مختصر جواب تھا ——— "یہ داستان تو بڑی سبق آموز ہے، مگر یک طرفہ روداد سن کر، سخت تشنگی کا احساس ہوتا ہے، آپ بھی اپنی روداد سنا کر کیوں نہ اس داستان کو پورا کر دیں" ماڈرن خاتون نے استدعا کی، اور تمام ہم سفر خواتین، یک زبان ہو کر، اُن سے اصرار کرنے لگیں — کچھ توقف، کچھ تامل کے بعد، صبیحہ نے آپ بیتی بیان کرنا شروع کی:

یہ ناسور بیس سال سے میرے سینہ میں رس رہا ہے، اس وقت اس کو کریدنے میں سخت تکلیف ہوگی، مگر ممتاز اپنی عہد شکنی پر نادم ہیں، اور مجھ سے عفو چاہتے ہیں، اُن کو شاید یہ نہیں معلوم کہ میں نے کبھی بھی اُن کو گنہ گار نہیں

سمجھا، جس روز خدا نے، ایک حسین اتفاق سے، میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اور جو بعد میں دنیا والوں کی دست درازی سے چھوٹ گیا، میں نے اُسی روز، اُن کے حق میں سب کچھ معاف کر دیا تھا، مگر انھوں نے تو کبھی کوئی غلطی ہی نہیں کی، سچی محبت اور پارسائی کے دعوے تو سبھی نوجوان کرتے ہیں مگر۔ چوں بہ خلوت می روند کارِ دیگری می کنند — اس معاملہ میں ممتاز کے کردار کی بلندی بے شک ناقابلِ عبور ہے — اُن کی جگہ کوئی دوسرا نوجوان ہوتا تو وہ میری دیوانگی سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا، مگر اللہ گواہ ہے کہ، بجز اُس اتفاقیہ واقعہ کے، جب کہ ہم دونوں کی انگلیاں آپس میں چھو اور گتھ گئی تھیں — اور جس کے دبنے میں غالباً میں نے ہی پہل کی تھی — اُنہوں نے پھر کبھی، ایک سے زائد موقع ملنے پر بھی، میرے بدن کا کوئی حصہ نہیں چھوا، حتیٰ کہ اُن کی وطن روانگی کے وقت، جب میں نے "خدا حافظ" کہہ کر اُن سے ہاتھ ملانا چاہا تو اُنہوں نے جھٹ اپنا ہاتھ، یہ کہہ کر کھینچ لیا، کہ "اللہ کے حکم کا کچھ دن اور انتظار کرو" — مگر افسوس وہ حکم میری تقدیر ہی میں نہیں تھا۔ صبیحہ یہ کہہ کر یوں ہی خاموش ہو گئیں، ماڈرن خاتون نے کہا "ممتاز معافی کے ذریعہ یہ بھی جاننا چاہتے ہوں گے کہ آپ، اُن کی بے توجہی کی وجہ سے، اُن کو بھول تو نہیں گئیں" — "بی بی! محبت کرنا جتنا آسان ہے، بھولنا اُتنا آسان نہیں، محبت تو عورت کے لئے ساری زندگی کا روگ ہے، بشرطیکہ محبت محبت ہو، میں نے اُن سے محبت کی تھی، سودا نہیں، شادی نہیں ہوئی، نہ سہی، اُس سے میری محبت میں کیوں فرق پڑے گا" صبیحہ کسی قدر جوش سے بولی — "ممکن ہے ممتاز کو یہ شبہ اس وجہ سے ہوا ہو کہ آپ کی ایک اچھی اور کامیاب شادی ہو گئی"۔

ماڈرن خاتون نے اپنا قیاس ظاہر کیا — "مروجہ زمانہ کے لحاظ سے آپ

میری شادی کو اچھی تو کہہ سکتی ہیں، رہا کامیاب کے بابت تو میں نے آپ کو
کچھ بتایا نہیں، اس سلسلے میں صرف یہ کہوں گی کہ عورت کی اول ہی محبت،
آخری محبت ہوتی ہے، کوئی بھی عورت، اپنے دل کا سودا کسی اور سے، اور جسم کا
کسی اور سے، ہرگز نہیں کرنا چاہتی، رواجاً جو رشتے کر دیئے جاتے ہیں،
جس میں صرف جسم کا اتصال ہو جاتا ہے، روح کا بالکل نہیں، وہ بدستور
پیاسی رہتی ہے۔ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔ بظاہر یہ کامیاب شادیاں،
صرف نمائشی ہوتی ہیں" صبیحہ نے بڑے تاثر سے اپنی رائے ظاہر کی۔
"آپ نے ممتاز کو حاصل کرنے کی خود اپنی کوشش کیوں نہیں کی؟" ماڈرن
خاتون نے دریافت کیا۔ صبیحہ بولی "افسوس! مجھے اس کا موقع
ہی نہیں ملا، ممتاز کے جاتے وقت، راست اقدام کی جو تجویز میں نے
پیش کی تھی، وہ اُنہوں نے، میری رسوائی کے خوف سے، منظور نہیں کی،
وہ اپنے یہاں پہنچ کر، اپنی والدہ کے ذریعہ، دوبارہ سلسلہ جنبانی شروع
کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اُن کی والدہ نے، روایتی ہتکنڈے
استعمال کرکے، اُن کا وہاں نکاح کر دیا۔ اور میں یہاں اپنا دل مسوس
کر رہ گئی۔ اُن کا اس طرح نکاح کرانے میں خود میرے خاندان والوں
کی ریشہ دوانیوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا، وہ انور کے لئے راستہ صاف کرنا
چاہتے تھے، اُن کو میرے دل کے ٹوٹنے کی فکر نہیں تھی، اُن کو صرف جائداد
ٹوٹنے کا ڈر تھا۔ مگر میں نے طے کر لیا کہ میرے دل کا گاہک تو گیا،
اب موروثی جائداد رہے، یا اُس کے ٹکڑے ہوں، میں انور کا منہ تو
کسی صورت میں، نہیں دیکھوں گی۔ مجھے ہموار کرنے کی بڑی کوششیں
ہوئیں، طاہرہ بیگم کو خاص طور پہ بلایا گیا، وہ گھنٹوں اپنا سر میرے ساتھ

کھپاتی رہیں، مگر میں اپنی ضد پر قائم رہی ——— اب ماڈرن خاتون اور دیگر ہم سفر خواتین نے صبیحہ سے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ ممتاز کی طرح، آپ بھی، اپنی محبت کے کچھ واقعات سنائیں —— وہ مسکرائیں، اور کہنے لگیں —— یہ محبت میرے دل میں کب، اور کیسے پیدا ہوئی، اس کا مجھے بالکل احساس نہیں ہوا، مگر یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ، اُس اُنگلیوں والے واقعہ سے قبل، میرے دل میں یہ تحریک پیدا ہو چکی تھی، اور میں ہلکے ہلکے یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ، میں اپنے دل پر نہیں، بلکہ میرا دل اب مجھ پر حکومت کر رہا ہے — محبت کی لوگ بہت سی نفسیاتی وجہیں بتاتے ہیں، مگر مجھے تو یہ سب اوٹ پٹانگ ہی معلوم ہوتی ہیں — میں نے اس معاملہ میں بہت کافی احتیاط برتی، پھر بھی، اپنی مرضی کے خلاف، اس میں، اس بری طرح، گرفتار ہو گئی — یہ تو آپ لوگوں نے ممتاز کے بیان کو پڑھ کر معلوم ہی کر لیا ہے کہ مجھ میں کوئی ہوش ربائی نہیں تھی، پھر بھی کوٹھی کی ساری کنواریوں میں لوگوں کی نظر انتخاب مجھ پہ ہی پڑتی تھی، شاید اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ میں کسی نوجوان کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی — وہاں صرف ممتاز ہی ایک ایسے نوجوان تھے جو میرے گاہک نہیں تھے، سو میں اُنکی گاہک ہو گئی — کہہ لیجئے یہ بھی فرائڈ کا کوئی نظریہ ہو گا کہ عورت اُس نوجوان کو پسند کرتی ہے، جو اُس کا دیوانہ نہ ہو ——"

"مگر آپ کا حسن تو اب بھی ایسا ہے جس پر کوئی بھی صاحب ذوق ریجھ جائے گا، نہ معلوم ممتاز کی ہوش ربائی کا معیار کیا تھا!" ماڈرن خاتون نے تکلف نہیں، خلوص کے انداز میں اُن کے حُسن کی تعریف کی — اور اُن کی ساری ہم سفروں نے تائید کی — صبیحہ بولی، "آپ لوگوں نے ممتاز کو نہیں

دیکھا، وہ واقعی انتہائی حسین ہیں، اُن کا انگریز ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ اُن کو "گلاب" کہہ کر پکارتا تھا ۔ ایک روز وہ کسی مشاعرہ میں جا رہے تھے، وسیم بھائی کو ساتھ لینے کوٹھی پر آئے، میری ایک پھوپی زاد، کوئی دس گیارہ سال کی، پیارے سے اُن کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جھول گئی "ممتاز بھائی! میں بھی مشاعرے میں چلوں گی" ۔ مجھے اُس کی یہ شوخی بُری لگی، ممتاز کے جانے کے بعد میں نے اُس سے پوچھا "کیوں شاہدہ، تو کس سے شادی کرے گی؟" بڑے بھولے پن سے بولی "میں تو ممتاز بھائی سے کروں گی" ۔ "اور اگر وہ تجھ سے نہ کریں تو؟" میں نے جرح کی ۔ تنک کر بولی "تو میں خود اُن سے کر لوں گی" ۔ میں نے پوچھا "تیرے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟" ۔ بولی "وہ مجھے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں، اور ..... اور ....." ۔ "اور کیا؟" میں نے اُسے کریدا ۔ ذرا شرما کر بولی "میرا دل کہتا ہے، وہ بھی مجھے چاہتے ہیں" ۔ یہ فقرہ ادا کر کے وہ یکبارگی جیسے کھل پڑی ۔ دوسرے دن میں نے شاہدہ کی یہ گفتگو ممتاز سے زبانی بیان کی، بہت ہنسے، کہا "یہ اپنے دل کی بات اُس معصوم پر کیوں تھوپتی ہو؟" ۔ جانے کیسے میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا "اللہ جانتا ہے، ہم دونوں سچے ہیں!" ۔ "تو آپ نے آخر، ممتاز سے، اپنی محبت کا اعتراف، اپنی زبان سے، روبرو، کر ہی لیا" ماڈرن خاتون بے تحاشا ہنسنے لگی ۔ "جی ہاں، زبانی بات چیت کا موقع بہت کم ملتا تھا، بہت ہی کم، البتہ خطوط صبح و شام، برابر آتے جاتے تھے، جب بھی میں تنہا ہوتی، بس خط لکھنے لگتی، بڑے لانبے خط، اچھے خاصے افسانے ۔ ممتاز دن میں کالج، شام کو فیلڈ اور ۶ بجے سے ۹ بجے رات تک طاہرہ باجی کے یہاں گپیں ہانکتے رہتے، پھر بھی صبح ہی صبح اُن کا ایک لانبا خط میرے پاس آ جاتا ۔ ؟" شاید وہ رات کی

رات خط ہی لکھتے تھے، میں نے سوچا وہ پڑھتے کب ہیں، میں نے اُن کو کئی بار سمجھایا، ایک بار ہنس کر کہنے لگے "صبیحہ، تمہاری محبت میں ایسی کہربائی تاثیر ہے کہ میں گھنٹوں کا کام منٹوں میں کر لیتا ہوں"۔۔۔۔ ششماہی امتحانات ہو رہے تھے، صبح انگریزی مضمون کا پرچہ تھا ۔۔۔ اُس روز وہ طاہرہ بیگم کے ہاں کوئی بارہ بجے رات تک بیٹھے شعر و شاعری کی باتیں کرتے رہے، میں بھی وہیں تھی، نہ وہ اُٹھے، نہ میں، نہ طاہرہ باجی ۔۔۔ طاہرہ باجی، اچانک غسل خانہ میں چلی گئیں ۔۔۔ وہ کبھی کبھی عمداً ہم لوگوں کو بالکل تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع دے دیا کرتی تھیں، شاید وہ اس طرح، اپنے بجھے ہوئے دل کو، ہم لوگوں کی وارفتگی دیکھکر بہلاتی تھیں ۔۔۔۔ خیر، تو میں نے ممتاز سے کہا "کیا آپ کل کا پرچہ خراب کرنے پر ہی تلے ہوئے ہیں!" ۔۔۔۔ وہ کھلکھلا کر ہنسے "صبیحہ! خدا کی قسم، تم صبح تک میری نگاہ کے سامنے اسی طرح بیٹھی رہو، اور میں اس پرچہ میں اول نہ آؤں، تو میں تم کو پھر اپنا منھ نہ دکھاؤں"۔۔۔۔ میں نے کہا "میں آپ کی اس انتہائی ذرہ نوازی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی، ورنہ آپ کے مقابلہ میں میری حیثیت کیا ہے"۔۔۔ ایک دم جوش میں کھڑے ہو گئے "اللہ جانتا ہے، تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو تو میں دنیا میں کیا نہیں کر سکتا"۔۔۔ نتیجہ معلوم ہوا، اُس پرچہ میں اُن کو سو میں ۹۲ نمبر ملے ۔

"کلائی کی گھڑی کی سرگذشت" پر مضمون لکھنا تھا، کالج پرنسپل صاحب کی توبیا ہتا میم صاحبہ نے جانچی، اُن کو لندن سے آئے ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے جانے ممتاز نے اُس میں بھی اپنی محبت کی ساری رنگین داستان لکھ ماری تھی، میم صاحب اُس مضمون سے اس قدر خوش ہوئیں کہ اُنھوں نے ممتاز کو اپنی سونے کی کلائی کی گھڑی انعام میں دے دی ۔ ممتاز اُس کو لے کر میرے پاس آئے،

کہنے لگے "جی میں آیا ہیم صاحب سے کہہ دوں کہ اس گھڑی کا مستحق میں نہیں ایک نگینہ سمجھتا ہے"، آپ ہی کی طرح بالکل گلاب جیسی! جو اس وقت میرے دل پہ حکومت کرتی ہے، اور میرے دماغ کے لئے ڈائنمو کا کام دیتا ہے" اُس وقت میرے دل میں ایک عجیب پُر کیف تلاطم بپا ہو گیا، اور میری زبان سے شکریہ کا بھی ایک لفظ نہ نکل سکا ۔۔۔ "حق بہ حقدار رسید" کہہ کر ممتاز نے وہ گھڑی میری کلائی پر باندھ دی، یکبارگی شدت جذبات سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا، اور میں بے تحاشا رو پڑی، وہ گھڑی آج بھی، میری کلائی پر، اُسی طرح بندھی ہوئی ہے ۔۔ صبیحہ کو اپنی گفتگو میں جیسے اب خود لطف آنے لگا تھا ۔۔۔ اُس نے کہا "میں ایک بار ممتاز کے کالج میں ڈرامہ شیریں فرہاد دیکھنے گئی، وہاں سے واپس آ کر میں نے اُن سے پوچھا "کیا واقعی کوہکن نے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تھی؟" ۔۔۔ "ہاں! اب تو میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں" ممتاز، معنی خیز انداز میں، میری طرف دیکھ کر مسکرائے، میں اُن کا اشارہ سمجھ گئی، میں نے کہا "جی! آپ کے یقین کا کیا کہنا، آپ تو مجھے بھی انسان کی بجائے، ڈائنمو سمجھتے ہیں" ۔۔۔ بات آئی گئی ہوئی ۔۔۔

اتفاقاً دوسرے ہی ہفتہ ایک غیر ملکی ہاکی ٹیم آئی، ممتاز کے کالج سے بھی اُس کا میچ قرار پایا ۔۔ فیلڈ پر جاتے ہوئے کوٹھی پر آئے، شاید وہ ہم لوگوں کو بھی دعوت دینے آ رہے تھے، وہ سیڑھی پہ چڑھ رہے تھے، میں اُتر رہی تھی، روبرو مڈھ بھیڑ ہو گئی، وہ سیڑھی اکثر ایسی پُر لطف ملاقاتیں کرا دیتی تھی ۔ وہ ٹھٹک کر بولے "میں دیوی جی کا درشن کرنے، اور آشیرباد لینے آیا ہوں" ۔۔۔ میں ہنسی "تو آپ کو پتھر کی دیوی چاہیئے، داسی نہیں" ۔۔۔ کہنے لگے "تم تو موم کی گڑیا ہو، اگر پتھر کی بھی ہوتیں تو اپنے پجاری کے لئے اتنی ہی پیاری ہوتیں، یا شاید اُس سے بھی زیادہ" ۔۔۔ میرے ہاتھ میں پان کی ایک گلوری تھی، میں نے ہنس کر اُسے اُن کو پیش کر دیا

"برگِ سبز است تحفۂ درویش" — ممتاز بالکل پان نہیں کھاتے تھے، حتیٰ کہ عید، بقرعید پر بھی نہیں — مسکرا کر بولے "لائیے، آپ بھی کیا یاد کریں گی، دیوی کا یہ پرشاد ضرور آج کوئی معجزہ دکھائے گا" — میں نے کہا "آج آپ ضرور سرخرو ہوں گے" — اُن کے جانے کے بعد میں نے اور طاہرہ بیگم نے حشمت سے میچ دیکھنے کے لئے کہا، وہ بھاگا بھاگا گیا اور ایک تانگہ لایا، ہم لوگ فیلڈ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کھیل ختم ہونے میں بس اب صرف پندرہ منٹ باقی ہیں، اور وہاں ساری نشستیں بھری ہوئی ہیں، فیلڈ کے چاروں طرف بھی کھیل دیکھنے والوں کا ہجوم تھا، بڑی مشکل سے ایک جگہ تانگہ کھڑا کرنے کی جگہ ملی، کھیل ختم ہونے کا وقت جوں جوں قریب آتا جا رہا تھا، مجمع کا شور بھی اُسی رفتار سے بڑھتا جا رہا تھا، لوگ اپنی ٹیم کو چیخ چیخ کر للکار رہے تھے کہ مخالف کی گول پر ٹوٹ پڑو، ہم لوگوں کے وہاں پہنچنے سے ذرا قبل مخالف ٹیم نے ایک گول کی برتری حاصل کر لی تھی، اور اب وہ لوگ دفاعی کھیل کھیل کر وقت ختم کرنا چاہتے تھے۔ اتنے میں مخالف ٹیم پر کارنر ہوا، ممتاز دوڑ کر رنگ پر پہنچے، ہم لوگوں کا تانگہ اُسی گول کی طرف کھڑا تھا، بے ساختہ ممتاز کو چھیڑنے کو جی چاہا، حشمت سے کہا ممتاز سے کہو، ہم لوگ اُن کی ہار دیکھنے نہیں آئے ہیں!" — وہ موذی واقعتہً دوڑ کر کہہ آیا۔ اتنے میں گیند فیلڈ میں واپس چلی گئی، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر اُسی رنگ پہ لوٹ آئی — مخالف ٹیم اپنے رنگ کا بُری طرح محاصرہ کئے ہوئے تھی، وہاں دوڑنا، چلنا نہیں، رینگنا بھی دشوار ہو رہا تھا، اتنے میں "تراق" کی ایک گرجدار آواز سنائی دی "WELL SCORED MUMTAZ" کے نعروں سے فیلڈ گونج اٹھی۔ رنگ سے فیلڈ کی طرف، ہاکی اُچھال کر، جاتے ہوئے ممتاز نے تانگہ کی طرف مسکرا کر اس طرح دیکھا جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں" دیکھا!

تم میرے پاس ہو تو میں کیا نہیں کر سکتا؟"۔۔۔۔ کھیل ختم ہونے میں مشکل سے اب تین منٹ باقی تھے، اسکور برابر ہونے پر فیلڈ میں وہ شور ہوا کہ خدا کی پناہ، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، اتنے میں ایک تیز سیٹی بجی، اور ساتھ ہی ریفری کی گرجدار آواز بلند ہوئی "ممتاز" "ریٹائر"۔۔ گھبرا کر میں نے سنٹر پر نگاہ ڈالی، دیکھا تو ممتاز کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے، مگر شاید اُن کو خود اِس کا احساس نہیں تھا، ریفری کی آواز پر اُنھوں نے اپنی پیشانی سے، اُبلتے ہوئے خون کو، پسینہ کی طرح، اُنگلیوں سے پونچھ کر کہا "کوئی بات نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں" اور ڈبلی کرنا شروع کر دی، وہ سنٹر سے گیند لے کر، سیدھے رنگ کی طرف لپکے۔ اُس وقت مجمع کا حال نہ پوچھئے، کہاں پہلے وہ شور، کہاں اب بالکل خاموشی، ہر شخص کی آنکھیں ممتاز پر جمی ہوئی تھیں۔ ممتاز اپنے خون کی ایک لکیر فیلڈ پر کھینچتے ہوئے رنگ پہ گیند لے کر پہنچ گئے، وہ بھی کیا منظر تھا، سرخ سپید چہرہ، سپید جرسی، سپید نیکر۔ سب پہ خون کی گل کاریاں ہو رہی تھیں، اور لبوں پر میرے دیئے ہوئے پان کی شوخ سرخی تھی۔ فیصلہ کن گول کا سب کو بے چینی سے انتظار تھا، کہ اب گول ہوا، اور تب گول ہوا صرف منٹ ڈیڑھ منٹ باقی تھے۔ مگر خدا کی پناہ! وہ ذرا سا وقفہ کتنا طویل ہو گیا، دونوں کھمبوں کے قریب قریب، تمام پلیر وہاں رنگ میں جمع ہو گئے، ہر ایک گول کرنے، اور گول بچانے کے لئے اپنی اپنی جان لڑائے ہوئے تھا، وہاں گیند کی وہ دُھنائی ہو رہی تھی، اور ہاکیاں اس طور پہ چل رہی تھیں کہ مجھکو تانگے میں اپنا سر چکراتا ہوا معلوم ہوا، میں اس وقت ممتاز کو نہیں دیکھ رہی تھی، اور نہ دیکھ سکتی تھی، صرف ریفری کا منھ تک رہی تھی کہ سیٹی بجے، خواہ گول ہو، یا کھیل ختم ہو، اور دل ہی دل میں اپنے کو کوس رہی تھی، اچھا امتحان لیا، خوب دعا دی،

یہ تو غریب کی جان ہی لے لی" اتنے میں تابڑ توڑ دو سیٹیاں بجیں، معلوم ہوا گول بھی ہوا، اور کھیل بھی ختم ہوا — ممتاز کو لوگ گود میں اُٹھا کر ڈریسنگ روم میں لے گئے — ہم لوگوں نے حشمت سے کہا کہ ہم لوگوں کو بھی وہاں لے چلو" وہ دوڑ کر پرنسپل کے پاس گیا، اور اُن سے کہا کہ ممتاز کی کچھ رشتہ دار خواتین اُن کو دیکھنا چاہتی ہیں، اجازت مل گئی، وہاں ہم لوگ پہنچے تو ممتاز کے ماتھے کی ڈرسنگ ہو رہی تھی، اور پرنسپل صاحب کی میم صاحبہ ممتاز کو چیر آپ کر رہی تھیں" ممتاز! یہ صرف تمہاری وکٹری ہے، مگر آخر وقت میں، تمہارے کھیل میں" یک بہ یک کیا جادو پیدا ہو گیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ تم گیند کی بجائے اپنی جان سے کھیل رہے ہو" اور دوسرا گول تو تم نے جیسے خون کی نہر میں تیر کر بنایا ہے" — اُن کے آخری فقرہ پر" اُس حالت میں بھی" ممتاز دفعتہً ہنس پڑے" اور میں" باوجود ضبط کرنے کے" اپنی بات یاد کر کے" رو دی — ممتاز نے میم صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا" میڈم! فرہاد نے تو شیریں کی محبت میں پہاڑ کاٹ دیا تھا، میں نے اپنی درس گاہ کے لیے اتنا سا خون ہی بہا دیا تو کیا بڑی بات ہوئی"—

" مگر تمہارا یہ خون بہلنے والی تمہارے مضمون کی وہ شیریں تو نہیں تھی" میم صاحب نے، ہنستے ہوئے، ہوا میں تیر چلا دیا، اور میں جھٹ طاہرہ بیگم کے پیچھے چھپ گئی، اور اُسی وقت اچانک ممتاز کی نگاہ اُس خلا پر اُٹھی جہاں میں لمحہ بھر قبل کھڑی تھی، اور اُن کی نگاہ کے تعاقب میں میم صاحب بھی اُس طرف تاک رہی تھیں اور مجھے وہاں دیکھتے ہی، ایک معنی خیز انداز میں، مسکرا کر، ممتاز سے بولیں "OH! THERE IT IS" اور پھر اُن کے مجروح ماتھے کو بوسہ دیتی ہوئی باہر نکل گئیں — میرے پاس معقول الفاظ نہیں ہیں، جو میں اپنے اُس وقت کے جذبات کی مرقع کشی کروں! — دوسرے روز وہ سر پر پٹی باندھے کوٹھی پر

آئیے، میں نے کہا "معاف کر دیجئے" ۔۔۔ پوچھا "کاہے کی معافی؟" ۔۔۔ آپ کا خون بہانے کی" میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا ۔۔ زور سے ہنسے "تم کو یاد نہیں، حضرت علی کے زخم سے، نماز میں تیر کھینچ لیا گیا، اور اُن کو کچھ پتہ نہیں چلا، وہ تو ایک مقبول خدا ہستی تھی، اب تم نے ایک ناچیز انسان کی محبت کا کرشمہ دیکھ لیا، کیوں؟ اب تو تم کو میری محبت کا یقین آیا" ۔۔۔ میں نے کہا "وہ کب نہیں تھا! اُس کے لئے تو خون بہانے کی ضرورت نہیں تھی" ۔۔۔ اُف، اب یہ واقعات یاد آتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے، بے غیرت زندگی ہے، زندہ ہوں، ورنہ ایسے محبوب سے چھٹ کر تو مجھے کبھی کا پیوند خاک ہو جانا چاہئے تھا" ۔۔۔

"واقعی، آپ کی زندگی کی روداد تو بالکل ایک افسانہ ہے، مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ پھر آپ شادی پر کیسے راضی ہوئیں؟" ماڈرن خاتون نے اِس راز سے بھی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ۔۔۔ فجر بھی اب ختم کے قریب تھا، تمام خواتین اُس کی تفصیل بھی جاننے کے لئے مصر ہو گئیں ۔۔۔ صبیحہ نے کہا "ممتاز کی شادی کے بعد میں دو سال تک بیمار رہی، میری زبان اب بند ہو گئی تھی، میں اب اندر ہی اندر پھنک رہی تھی، میری زندگی کی کوئی اُمید باقی نہیں تھی، مگر نامراد زندگی تھی، بچ گئی، میرے کنبہ والوں کو اب اپنی زیادتی کا احساس ہوا، اب تو ممتاز کی طرف سے مایوسی ہو چکی تھی، اپنے والدین کی میں تنہا لڑکی تھی، وہ بھی اُن کی آخیر عمر کی، ہمارے معاشرے میں۔ اونچے طبقہ میں، لڑکیوں کی شادی کا خیال، اُن کے والدین کو، اکثر اپنی روانگی کے وقت ہوتا ہے، اُس سے قبل یا تو خواب خرگوش میں رہتے ہیں، یا خوب سے خوب تر کی تلاش ہی بلکہ انتظار میں، ہوا میں اُڑتے رہتے ہیں ۔۔۔ میرے والد بھی اب میری شادی کے لئے بے چین ہو گئے، بیمار ماں تو واقعتاً ستیہ گرہ پر اُتر آئیں۔ مجھے بہت پھسلایا، سمجھایا،

اپنے دودھ کی قسم دی، مگر میں برابر انکار کرتی رہی، میری علالت کا سلسلہ جاری رہا، کبھی حالت ذرا سنبھل جاتی، پھر پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جاتی — میرے معالج کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی۔ — ڈاکٹر بوڑھا، تجربہ کار،" اور بے حد ہوشیار تھا، خود اُس کی ایک لڑکی، اُس محبت کے چکر میں، خودکشی کر چکی تھی، اُس نے میرے والد سے کہا "اس کے جسم سے زیادہ، اس کے جذبات مجروح ہیں، اور اس کی فطرت ضدی ہے، کسی نوجوان سے اس کو محبت ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی مامتا کی حس اگر بیدار ہو جائے تو اس کو اپنی زندگی میں ضرور دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے، کیونکہ عورت بنیادی طور پر ماں ہوتی ہے۔ . . . . . . " — مگر اُس کا بھی تو پہلا زینہ شادی ہی تھا، اور وہ ٹیڑھا مسئلہ تھا — اس موقع پر اُس بوڑھے ڈاکٹر نے ایک نو عمر، ہوشیار لیڈی ڈاکٹر کو میرے علاج کے لئے تعینات کر دیا، خود کبھی کبھی صرف معائنہ کے لئے آتا — لیڈی ڈاکٹر علاج سے زیادہ میری دلجوئی میں اپنا وقت صرف کرتی، میں رفتہ رفتہ اس سے بہت مانوس، اور پھر بے باک ہو گئی، یوں بھی ہم دونوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا، اُس کے حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے، یا اُس نے مصلحتاً مجھے ایسا ہی بتایا، کہنے لگی "یہ پریشانی زیادہ تر لڑکیوں کو جھیلنی پڑتی ہے، مگر ستی ہونا عقلمندی نہیں، انور نے تم کو زک دیا ہے، تم اُن سے انتقام لو، اور اُس کی صرف یہ صورت ہے کہ تم، ان کی شادی سے پہلے، کہیں شادی کر لو، اس طور پر تمہارے والدین کی بھی تسکین ہو جائے گی، اور انور بھی جل بھن مریں گے . . . . " میں نے بھی اُس کی رائے پر غور کیا، کچھ معقول معلوم ہوئی، میرے دل میں صرف دو جذبات تھے، "ممتاز سے محبت" اور انور سے انتقام — والدین کے اصرار کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی،

اسی دوران میں ماں کو کینسر ہوگیا، مجھے اُن کی حالت پر ترس آیا، میں نے اُن سے "ہاں" کردی کہ آپ انور کے علاوہ، جہاں چاہیں، اپنی مرضی سے میری شادی کردیں ــ شوہر کے انتخاب میں تو اب مجھے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی، بس روایتی شادی کرنی تھی، وہ ہوگئی، ویسی ہی جیسی ہماری ہزاروں بہنوں کی روزانہ ہوتی ہے، سال کے اندر ہی بچہ ہوا، بالکل ممتاز کی شکل کا، یکسوئی نہیں تھی، معقول داشت نہیں ہوسکی، ضائع ہوگیا، غم پر غم لاحق ہوا، مگر اب تو ے

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

ــ کی صورت ہوگئی تھی، پھر اور بچے ہوئے، اور وہ اب میری زندگی کے مرکز بن گئے، اور میرا شکستہ دل میری محبت کا مزار بن کر رہ گیا۔ اب بھی میں سکون کے لمحوں میں، اپنے عقیدت کے آنسوؤں کی چادر اُس پر چڑھاتی ہوں ــ اس سلسلہ میں میں ایک خاص واقعہ سناؤں ــ میرے پاس، اُس زمانہ کا، ایک فیملی گروپ ہے، اُس میں ممتاز بھی ہیں، میں نے اس فوٹو کو اپنے بیڈروم میں لگا رکھا ہے ــ ایک روز میری لڑکی نے، ممتاز کی تصویر پر انگلی رکھ کر، مجھ سے اچانک پوچھا "ممی! کیا یہی وہ صاحب ہیں، جن سے آپ شادی کرنا چاہتی تھیں، مگر انور صاحب نے نہیں ہونے دی؟" ــ میں نے اُسے ٹالنے کی بجائے اقرار کرلیا "ہاں بیٹی، تم نے صحیح سنا ہے!" ــ وہ جھٹ بول اُٹھی "ممی! وہ دن بیت گئے، اب ایسی زیادتی نہیں برداشت کی جاسکے گی" ــ "بی بی! تم اطمینان رکھو، تمھارے لئے تو میں سینہ سپر ہو جاؤں گی" ــ وہ خوش ہوگئی، اور میں نے محسوس کیا کہ میری قربانی رائیگاں نہیں گئی ــ ماڈرن خاتون اچانک بول اُٹھیں "آپ کی بیٹی کو یہ چیز معلوم ہوگئی تھی، تو کیا آپ کے شوہر کو اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی، اور اُنھوں نے آپ سے کبھی کچھ پوچھا نہیں؟" ــ

—— میں نے کہا" اُن کو بھی یہ حالات ضرور معلوم ہوں گے، کوٹھی میں داخل ہونے والا کوئی بھی اس بازگشت کو سنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، لیکن اُنھوں نے کبھی بھی مجھ سے اس سلسلہ میں کوئی گفتگو نہیں کی، اگر وہ مجھ سے پوچھتے تو میں انکو سب کچھ بتا دیتی"—— ماڈرن خاتون بولیں" تو اب ان علایق دنیاوی میں پھنس کر ممتاز کی محبت میں کچھ کمی تو ضرور آ گئی ہو گی"——

"بالکل نہیں، بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ اُس میں زیادتی، اور پختگی محسوس کرتی ہوں، مگر ہاں، اب اُس کے علاوہ بچوں کے پیار اور اُن کی ذمہ داریوں کا احساس بھی بڑھتا جا رہا ہے، ورنہ میں وہی ہوں، ممتاز وہی ہیں، اور وہی اُن کی محبت، کاش کوئی اُن سے یہ کہہ دے!"

"میں کہہ دوں!" ماڈرن خاتون نے ہنس کر پوچھا—— "وہ کیسے؟" صبیحہ نے دریافت کیا—— "بس اسی طرح سے جیسے اُن کا پیغام آپ تک پہنچا ہے" ماڈرن خاتون نے، اپنا پرچہ ہاتھ میں ہلاتے ہوئے، اپنی اسکیم بتائی، اور تمام ہم سفر خواتین، یکبارگی ہنس پڑیں—— ٹرین اپنے مستقر پر پہنچ کر رک گئی، سواریاں اُتر کر، اپنی اپنی راہ پر چل پڑیں—— ماڈرن خاتون نے، تانگہ پر بیٹھے ہوئے، اپنی ہم سفر کو پکارا" ارے آپ نے اپنا اصل نام تو بتایا ہی نہیں؟"—— رومال ہلا کر" وہ مسکرا کر، بولیں" بس وہی صبیحہ!"——

معافی کا شکریہ

(قسط سوم)

رفیق نے وہ دونوں ماہ نامے، جن میں "پشیمان" اور اُس کے جواب میں "پشیمان کو معافی" کے افسانے شائع ہوئے تھے، ممتاز کو، ڈاک کے ذریعہ بھیج دیئے ___ اور اُن افسانوں کے عنوان کو سرخی سے مارک کر دیا ___ وہ اب اس تہیہ میں تھا کہ ممتاز کو، اس کامیاب معافی پر، مبارک باد کا ایک خط لکھے، اور اُس سے اجازت لے کر، ایک اور افسانہ کے ذریعہ، صبیحہ کی اس سیر چشمی پر، اُس کا شکریہ ادا کر دے، اسی دوران میں ممتاز کا ایک زور دار خط آ گیا۔ اُس نے خود رفیق کو، اس سلسلہ میں، دوبارہ قلم اُٹھانے کی ہدایت کی ___ مگر رفیق نے سوچا کہ وہ کیوں نہ اب اپنا پردہ ہٹا کر، ان دونوں فدائیوں میں، المکتوب نصف الملاقات، کی صورت پیدا کر دے آخر ان دونوں کی محبت زیادہ تر تو خطوں ہی کے ذریعہ پروان چڑھی ہے۔ ظاہر ہے جو سکون صبیحہ کو اپنے پرستار کے خط سے ملے گا وہ کسی افسانوی

شکریہ سے نہیں مل سکتا۔۔ بس رفیق نے ممتاز کے خط کو جوں کا توں شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔۔

"ڈیئر رفیق ۔۔ تم بھی عجیب شئے ہو، بے حد عجیب، آخر نہ مانے، سوتا فتنہ جگا کر ہی دم لیا۔ تمہارا ایک پوسٹ پہنچا، دفتر نے نمونے کا پرچہ سمجھا، اُسے لائبریری میں بھیجدیا، وہاں پر تمہارے نشانات پر غور کیا گیا، پھر پتہ پر، لائبریرین اُس کو میرے پاس لے آئے ۔۔ کوئی ہفتہ بھر بعد میں ایک روز سینما گیا، بیوی میرے ساتھ تھیں، ہم لوگ فلم دیکھ رہے تھے کہ، دفعتاً پچھلی سیٹ سے، ایک زنانی آواز سنائی دی ۔۔ "داہنے ہاتھ پر، سیاہ سوٹ میں، "پشیمان" والے ممتاز صاحب ہیں ۔۔ میں دھک سے ہو گیا، اور اُس طرف اپنے کان لگا دیئے، طبیعت میں اچانک ہیجان، سامنے فلم کی تیز دوڑ، بیوی کی بار بار سرگوشی، بچوں کے قہقہے، مزید گفتگو کچھ صاف نہیں سنائی دی ۔۔ تھوڑی دیر کے بعد انٹرویل ہوا، روشنی ہوئی، بیوی بچوں کو لے کر باہر چلی گئیں، ہال میں اب ذرا خاموشی ہوئی تو دو عورتوں کی گفتگو صاف سنائی دینے لگی ۔۔ "آپ کو کچھ دھوکہ ہوا، یہ تو اپنے اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں" ۔۔ "جی ہاں! ۔۔ "مگر ان کا نام تو ممتاز نہیں۔۔۔ بلکہ ۔۔۔ ایک اور۔۔۔۔ اچھا سا نام ہے" ۔۔ "اچھا ہی نہیں، اُن کی صورت ہی جیسا، بہت اچھا نام ہے، بالکل اسم بامسمیٰ، مگر ہیں یہ وہی بزدل ممتاز" ۔۔ "وہ کیسے؟" ۔۔ "آپ نے اُن دونوں افسانوں کو تو غور سے پڑھا تھا" ۔۔ "جی ہاں" "بہت غور سے" ۔۔ "آپ نے ہاکی میچ میں ممتاز کے ماتھے کی چوٹ کا حال بھی پڑھا ہوگا" ۔۔ "ہاں، وہ خوب یاد ہے" "تو پھر آپ اپنے بچے کو بھیج کر اُن کی پیشانی پر وہ نشان دکھلوا لیجئے، آپ کو اطمینان

ہو جائے گا"___

"مگر آپ نے اُسے دیکھا کیسے؟ اور پھر ایک نشان سے یہ نتیجہ کیوں نکال لیا کہ یہ وہی ممتاز ہیں؟"___"دیکھئے، بات یوں ہے کہ میرے شوہر کو، اسکول لائبریری میں جب یہ پرچے ملے تو اُنھوں نے اُن نشانات پر غور کیا، اُن افسانوں کو پڑھا، پتہ پر ہیڈ ماسٹر صاحب کا نام دیکھا، وہ اُن پرچوں کو اُن کے پاس لے گئے، ہیڈ ماسٹر صاحب پہلے تو اُن افسانوں کو دیکھ کر زیر لب مسکرائے، پھر یکبارگی اُن کا ہاتھ اپنی پیشانی پر، اس طور پر اُٹھ گیا، جیسے وہ اپنے چہرے کا کوئی داغ چھپانا چاہتے ہیں، وہ پرچے اُنھوں نے اپنے پاس رکھ لئے، پھر میرے شوہر، دوسرے روز بازار سے وہ دونوں پرچے لے آئے" جو میں نے آپ کو پڑھنے کے لئے دیئے تھے"___"اچھا یہ بات ہے! اسی وجہ سے بزرگوں نے کہا ہے کہ ؎

نبشر راز دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے

راز جب دل سے زبان پہ آیا تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب، کیسے، اور کس ذریعہ سے فاش ہوگا، مگر وہ فاش ہو کر رہے گا ضرور، صبیحہ نے چلتی ہوئی ٹرین میں، چلتے ہوئے مسافر سے، گم نامی میں، اپنا راز بیان کر کے، اپنی اتنی پرانی چوری پکڑوا دی"___"مگر آپ اسے چوری کیوں کہتی ہیں؟ صبیحہ تو اپنی محبت کو اللہ کی نعمت جانتی ہے!"___"تو پھر وہ صبیحہ سے پردے سے باہر کیوں نہیں آتی؟"___"یہ اُس کی غلطی ہے، یا سماج کی، جس نے اپنے گرد دھوکے کا جال بُن رکھا ہے، خود دھوکہ دیتا ہے، دھوکہ دینا سکھاتی ہے، اور اس کو کلچر کا نام دیتی ہے، لڑکوں کے لئے رومانس مباح، اور لڑکیوں کے لئے گردن زدنی، ایسی صورت میں صبیحہ کیا کرے، اپنی زندگی تو

وہ داؤں پر لگا سکتی ہے، اور اُس نے لگا بھی دی تھی، مگر نتیجے کے پردہ سے باہر آ کر اپنی بچی کی زندگی کیسے برباد کر دے!" —— "ہاں، یہ تو ہمارے معاشرے کی ستم ظریفی ہے، مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، کہ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب تو بہت خوش چلن مشہور ہیں، یہ ان دل لگیوں میں کیسے پھنس پھنسا گئے" —— "اس میں چلن کا کیا سوال ہے، کیا محبت کرنا لفنگوں کا کام ہے، بہت ممکن ہے، اُن کی یہ خوش چلنی اسی محبت کے باعث ہو!" —— "وہ کیسے؟" —— "سچی، اور ناکام محبت انسان کے دل میں درد پیدا کر دیتی ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"

ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

"مگر ایسے لوگ تو دردِ دل ہی کی نذر ہو جاتے ہیں، اُن کی محبت کا شیشہ خون ہی ہوتے دیکھا گیا ہے" —— "وہ تو بے شک ہوتا ہے، محبت تو نام ہی قربانی کا ہے جان کی ہو، مال کی ہو، یا ارمان کی، اس سودے میں منافع کم، اور دنیاوی لحاظ سے، گھاٹہ زیادہ ہوتا ہے" —— "مگر ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

"مگر یہ اختیار کی چیز کب ہے! یہ تو ایک فطری جذبہ ہے، جو دق کے جراثیم کی طرح، موافق ماحول پا کر، فوراً اثر انداز ہو جاتا ہے، اور اس کے لئے مرد، عورت، یا عمر کی، کوئی قید نہیں ہے" —— "محبت کے فلسفہ پر آپ کی نگاہ بڑی گہری ہے، کبھی آپ خود تو نہیں اس میں گرفتار ہوئی ہیں؟" —— "ہو سکتا ہے، میں بھی ہوئی ہوں، اور آپ بھی، اسی ہال میں دیکھئے، کتنے نوجوان اپنی بیویوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، ان میں سے کتنوں نے، شادی سے قبل، کسی لڑکی سے محبت، یا رومان نہیں رچایا ہے، وہ ساری کی ساری لڑکیاں تو کوٹھے کی زینت نہیں

بن گئیں، وہ ہمیں آپ میں تو ہیں، صرف غلط نمبروں کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہیں، اِن میں جن کا رومان صرف تفریح کی حد تک تھا، وہ تو اپنی موجودہ زندگی ہنس بول کر گذار رہی ہیں، جن کی محبت حقیقی تھی وہ، اندر ہی اندر سُلگ کر، اپنا وقت کاٹ رہی ہیں، کچھ بدنصیب، رومانس میں ٹھوکر کھا کر، نائٹ کلب آباد کر دیتی ہیں"۔۔ ـــــ "مگر لوگ تو نوجوانی کی محبت کو نشہ کہتے ہیں، جو موسمی سیلاب کی طرح ایک دم چڑھتا ہے، اور اُسی تیزی سے اُتر بھی جاتا ہے"۔۔ ـــــ "یہ اُس محبت کی شکل ہے، جہاں صرف جنسی طغیانی ہوتی ہے، وہ محبت نہیں، ہوس ہوتی ہے، محبت تو نام ہے دو دلوں کے روحانی ارتباط کا، اب آپ صبیحہ کی ہی محبت کی سحر کاری دیکھئے، اُس نے ممتاز کی ایسی بے میل طبیعت میں اتنی پائیدار محبت پیدا کر لی"

وقفہ ختم ہوا، فلم شروع ہو گئی، میرا دماغ گویا بیس سال پہلے لوٹ گیا، مجھے پردہ پر اب صبیحہ نظر آنے لگی، وہی گول چہرہ، وہی میانہ قد، وہی سڈول جسم، وہی مترنم آواز، وہی دلکش مسکراہٹ، وہی اندازِ گفتگو، بات مختصر، مگر بڑی پُراثر ـــــ فلم ختم ہو گئی، معلوم ہوا میں کوئی خوش گوار خواب دیکھ رہا تھا ـــــ کہاں وہ صبیحہ، کہاں وہ ہوسٹل، کہاں وہ کوٹھی، کہاں وہ کوٹھی کی وہ کھڑکی، جو ٹھیک میرے کالج کے چھوٹتے وقت، دو برس تک، بلاناغہ کھلتی تھی، اور دیدباز دید کے بعد فوراً بند ہو جاتی تھی ـــــ یہ باتیں، یہ یادیں، میری زندگی کا سرمایہ بن کر رہ گئی ہیں ـــــ تمہارے اِن دونوں افسانوں نے، اور اُن دونوں عورتوں کی گفتگو نے، آج میرے زخم کو پھر ہرا کر دیا ہے، میں نے تو اپنے مجرمانہ ضمیر کو یہ سوچ کر تسلی دے لی تھی کہ، اس طویل عرصہ میں، اُس کی نسوانیت اُس پر غالب آ گئی ہو گی، اور وہ علائق دنیاوی میں پھنس کر، اس

محبت کو، ایک خوش گوار خواب کی طرح، بھول گئی ہوگی۔ مگر تم نے ایک عجیب تدبیر سے، اُس کو ڈھونڈ نکالا، اور اُس کی سفاک انگلیوں سے میرے دل کے پھپھولے تڑوا دیئے، خیر مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں، مجھے تو اُس کی جدائی کی بے چینی میں ایک گونہ سکون ملتا ہے، مگر تم نے اُس غریب کو بھی اب بے چین کر دیا، جس کی زبان اور قلم، دونوں پر، تالے پڑے ہوئے ہیں، جانے کیسے اُس نے اپنی چنگاری بجھائی تھی، تم نے اُسے پھر لو دے دی — تم کو اُس کی آتشِ محبت کا صحیح طور پر احساس نہیں ہے، پناہ بہ خدا! میں اُس میں جل بھُن نہیں گیا، اب تک زندہ ہوں، تعجب ہے، شاید مایوس و نامراد زندگیاں طویل ہوہی جاتی ہیں، جیسے برسات کی اندھیری، غم گین رات، کاٹے نہیں کٹتی — دیکھی تم نے اُس کی ضد، اُس کی یہی ضد تو مجھ کو بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی، خود مجھ میں جو اُس کی کمی تھی، اُسی کوتاہی نے تو مجھے آج یہ دن دکھایا، جو میں اُس پیکرِ وفا کو کھو بیٹھا — مگر اُس کے پائے استقامت میں کبھی کوئی لغزش نہیں آئی، اُسے محبت کرنے ہی میں نہیں، اُس کو قائم رکھنے میں بھی مجھ پر فوقیت حاصل تھی — بہرکیف، وہ پہلا افسانہ تو تمھاری اپنی خواہش بلکہ ضد تھی، وہ تم نے کرلی، اُس کا جواب بھی غیب سے ٹپک پڑا، اب میری خواہش ہے کہ اُس "معافی" کے جواب میں، تم ایک شکریہ لکھو، قلم تمھارا، زبان میری ہو، اُس میں تم صبیحہ کی عفوِ خسروانہ کا اُسے میرا دلی شکریہ ادا کر دو، مگر شکریہ تو اُس کے ایثار کے اعتراف کے لئے بڑا ہی کم مایہ لفظ ہے، خیر، تم تو افسانہ نگار ہو، کوئی اور معقول سا لفظ تلاش کرلینا،

مگر مجھے خوف ہے کہ شاید ہی تم کو کوئی لفظ اُس کی شایانِ شان مل سکے ۔ لوگ کہتے ہیں، عورتیں تنگ نظر، تنگ دل، کینہ پرور ہوتی ہیں، مگر تم میری بدعہدی کے جواب میں اُس فرشتہ خصائل کی عالی حوصلگی تو دیکھو۔ ہے کوئی جواب صبیحہ کی اس عطا کا! اس معافی کی لذت قیاس نہیں کی جا سکتی، اس نے صبیحہ کی انگلی کی اول لمس سے بھی زیادہ مجھے محظوظ کیا ہے، میرے دل کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے ہیں ۔۔۔ مجھے دنیا پر ہنسی آتی ہے، وہ کتنی اندھی ہے، کہتی ہے صبیحہ سے تمھارا اب کیا واسطہ، وہ اب تمھاری کوئی نہیں ہے ۔ ارے وہ تو میری رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ میں نے دنیا دیکھی، بے شمار لوگ دیکھے، گوناگوں دلچسپیوں سے سابقہ پڑا، مگر وہ نہ بھولنا تھی، نہ بھولی، یہ اُس کا سرایت کرنا نہیں تو اور کیا ہے!

۔۔۔ دنیا نے محبت کو صرف شادی ہی میں محدود کر رکھا ہے، گویا عورت کا دل نہیں ہوا، ایک خوش نما پودا ہوا، جسے جس زمین پر چاہا، لگا دیا، اور یہ نہیں غور کیا کہ، ناموافق زمین میں وہ کبھی نہیں کھلتا، فوراً مرجھا جاتا ہے ۔۔۔ مگر دنیا نے تو، اپنی عقل کے زعم میں، خدا کو بھی بھلا دیا ہے، پھر وہ یہ کیسے سمجھے کہ شادی، اور محبت، دو بالکل جدا جدا چیزیں ہیں، بلکہ بعض حالات میں، قطعی متضاد ۔ لیکن انسان کے زیادہ تر فیصلے تو عقل سے کم، اور اپنی خواہش سے زیادہ، ہوتے ہیں، اور اُس کے جواز میں وہ ایک سے ایک منطقی، اور نفسیاتی دلیلیں تلاش کرتا پھرتا ہے ۔ مگر ذرا غور کرو، لوگ کہتے ہیں، عورت کو، اپنی محبت، صرف شوہر کے لئے وقف کر دینا چاہئے،

چاہیئے تو، یوں تو بہت ہی چیزیں چاہئیں، مگر سوال چاہنے کا نہیں، ہو سکنے کا ہے، ہوں گی تو وہی جو ممکن ہیں ــــ اب ذرا وقف کی اول شرط کو دیکھو، واقف کو اُس چیز کا، بلا شرکت غیرے، مالک ہونا چاہیئے، اور جو قدرت نے کسی کو، کسی مخصوص چیز کا، صاحب اختیار مالک ہی نہ بنایا ہو تو، وہ اُسے شوہر، یا کسی خاص آدمی کے حق میں، کیسے وقف کر دے ــ مگر ہاں، ناقص وقف بھی تو ہوتے ہیں، مال کسی کا، وقف کسی نے کر دیا، شادی کی محبت کو بھی ایک ایسا ہی وقف سمجھ لو ــــ گویا اب محبت بھی عائلی قانون کے تحت آ گئی ــــ مگر معلوم ہے، جس چیز پر کنٹرول لگتا ہے، وہ فوراً بلیک مارکیٹ میں چلی جاتی ہے، معاشرے نے محبت پر کنٹرول کیا، وہ گراں مایہ شے بلیک مارکیٹ میں منتقل ہو گئی ــــ شادی کے اشتہارات روزانہ اخباروں میں چھپتے ہیں، کبھی محبت کا بھی کوئی اشتہار چھپا ہے، کیسے چھپے! بیویاں، اور شوہر تو کھلے بازار میں ملتے ہیں، یا بکتے ہیں، مگر محبت تو اس طرح نہیں بکتی ــــ عقل بک جائے تو کوئی بات نہیں، وہ تو کبھی گھاس بھی کھا لیتی ہے، مگر دل، تو دل ہے، کیا امیر، کیا غریب، سب ہی کے پاس تو ایک دل ہوتا ہے، اور وہ اُس کا بادشاہ ہوتا ہے، اور وہاں اُس کے دل پر جو ملکہ بیٹھ گئی، بیٹھ گئی ــــ محبت میں جنسی کشش بھی ہوتی ہے، اور بعض اوقات، غیر محسوس طور پر، اصل محرک وہی ہوتی ہے، مگر جب وہ کشش دو طرفہ شکل اختیار کر لیتی ہے تو صورت بدل جاتی ہے، اور وہ محبت، ناکام ہونے پر، ساری عمر کے لیے مستقل ٹیس بن جاتی ہے ــــ لوگ کہتے ہیں کہ مشرق، مشرق ہے، اور

مغرب، مغرب، اور یہ دونوں سرے کبھی نہیں ملتے، مگر ذرا محبت کے نظریہ پر مشرق اور مغرب کا اتحاد دیکھیے، شکسپیر کہتا ہے:۔

"LOVE IS NOT LOVE,
WHICH ALTERS WHEN IT ALTERATION
FINDS OR BENDS WITH THE REMOVER
TO REMOVE."

اور پھر مشرق کی تائید پر بھی غور کیجئے ؎

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

یہ نہ محض شاعری ہے، نہ توارد، یہ زندگی کے حقائق ہیں — اب یوں سمجھیے، دنیا میں ہر روز طلاقیں ہوتی ہیں، شادی کے بعد جلد بھی، اور بہت دیر میں بھی، ان میں کتنے مرد، اور عورتیں، علیحدگی کے بعد بھی باہم محبت کرتے رہتے ہیں، شاید ہی کوئی، بلکہ کوئی نہیں، مگر اپنے بچوں پر، اُس حالت میں بھی، دونوں جان چھڑکتے ہیں، آپس میں بددلی رہتی ہے، اور بعض اوقات کھلی دشمنی — باپ اولاد کو عاق کر کے بھی اُس کی موت پر روئے گا، مگر کتنے شوہر، اپنی مطلقہ بیوی کی موت پر، آنسو کے دو قطرے بھی بہائیں گے، کوئی بھی نہیں — صبیحہ کہتی ہے، اور مجھے بالکل یقین ہے، کہ اُس کی محبت ویسی کی ویسی ہی ہے، اُس کے قول کی تصدیق

خود میرا دل بھی کرتا ہے، کبھی مجھکو اُس سے کوئی خواہش رہی ہو" اب بجز اِس کے کوئی خواہش نہیں کہ وہ" اپنے بال بچوں میں خوش و آباد رہے — پھر بھی میرے دل میں اُس کی یاد کا یہ حال ہے کہ ؎

کٹتی ہی نہیں رات، ڈھلی جاتی ہے
بجھتی ہی نہیں شمع، جلی جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی
سینے میں چھری ہے کہ چلی جاتی ہے

اُس کی محبت پر زمانہ اور فاصلہ کا کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ اُس میں اور اضافہ ہو گیا ہے — دنیا میں بہت سے بندھن ہیں، سب سے مضبوط محبت کا، قدرتی جو ہے، سب سے کمزور شادی کا، مصنوعی جو ٹھہرا، ایک توڑنے سے نہیں ٹوٹتا، دوسرے کو ٹوٹتے دیر نہیں لگتی، آخر الوہی عطیہ اور انسانی معاہدہ میں، زمین اور آسمان کا فرق تو ہو ہی گا — ایک عام مغالطہ ہے کہ، ہر شادی شدہ شخص، ایک عورت کے دل کی "گراں بہا دولت پر" بلا شرکت غیرے، قابض ہے، قابض تو وہ بے شک ہے، مگر اُس کے دل پر نہیں صرف اُس کے جسم پر — اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ حاکم خزانہ، مالک خزانہ نہیں ہوتا — مردم شماری کے کاغذات میں ایک عورت کسی کی بیوی درج کی جا سکتی ہے، مگر کیا اُس کے دل پر بھی وہی نام نقش کرنا اُتنا ہی آسان ہے؟ اور اگر نقش کرنا آسان نہیں، تو پھر نقش شدہ کو مٹانا کیسے ممکن ہے؟ — مگر ان باتوں پر کوئی غور ہی کیوں کرے، آخر کسی کو بیوقوف بنا کر ہی تو آدمی

خوش ہوتا ہے، تو خود بھی تو بیوقوف بن کر ہی خوش رہ سکتا ہے ـــ ورنہ دل سے زیادہ، دماغ سے کام لے، تو روز روشن کی طرح عیاں نہ ہو جائے کہ ازدواجی محبت، دراصل نام ہے، جسنی کشش، معاشرتی پابندی اور اقتصادی مجبوری کا۔ ان تعلقات میں اگر باہم رواداری رہی تو فریقین میں ایک طرح کا اُنس ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اُسے اپنی تسکین کے لئے لوگ "محبت" کہہ لیتے ہیں، ورنہ اس محبت کی حقیقت بالکل ویسی ہی ہے، جیسی مصلحت اندیش ماتحتوں کی اپنے افسروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ ظاہر میں کچھ، موجودگی میں کچھ، تبادلہ پر کچھ، اور پنشن پر کچھ بھی نہیں ـــ پھر نئے آنے والے کے ساتھ وہی صورت، گویا اس سے قبل کوئی اور اُن کی توجہ کا مرکز تھا ہی نہیں ـــ زندگی کا کاروبار چلانے کے لئے یہ اسٹیج ایکٹنگ ضروری ہے۔ اس طور پر زندگی تھوڑے سکون کے ساتھ بسر ہو جاتی ہے، ضرورت رفع ہوئی، ایکٹنگ ختم۔ شادی کی محبت بھی بالکل ایسی ہی ایکٹنگ ہے۔ ہر عقد ثانی کرنے والی عورت اپنے موجودہ شوہر کو، پہلے سے بہتر بتاتی ہے، پہلے کو مرجح بتا کردہ اپنی دوسری شادی کیسے قائم رکھ سکتی ہے، ظاہر ہے ایسی صورت میں، وہ ایکٹنگ کر کے ہی تو خوش رہ سکتی ہے ـــ میری زندگی صبیحہ سے جدا ہو کر، زیادہ تلخ اس وجہ سے ہے کہ، اس جدائی کی، سراسر ذمہ داری میری اپنی کوتاہی ہے۔ محبت ہم دونوں نے مل کر کی، اور جدائی صرف میری وجہ سے ہوئی ـــ بس ایک چیز اس حادثہ میں قدرے تسکین کا

باعث ہے، وہ یہ کہ شاید اُس کو حاصل کرکے میں دنیا کو اُس کے کردار کی یہ بلندی نہ دکھا سکتا، شہادت کا درجہ تو دنیا شہید ہونے پر ہی دیتی ہے اُس کی جدید تصدیق نے، اُس کی محبت کو، میرے لئے مزید پرستش کی چیز بنا دیا ہے ــــ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی محبت کسی قیمت پر فروخت نہیں کرے گی، محبت اُس کے بس میں کب تھی، وہ تو خود محبت کے بس میں تھی، وہ بار بار اپنے خط میں یہ لکھتی رہتی تھی، وہ اپنے خطوں میں تو جانے کیا کیا لکھتی تھی، بعض باتیں تو وہ اپنی کم عمری میں ایسی لکھتی تھی، جو پختہ کار کے لئے بھی ممکن نہیں تھی۔ اُس نے ایک بار لکھا "محبت بار بار فروخت نہیں ہوتی، قبضہ قانونی، یا غاصبانہ جو بھی کرے، حکومت اُس پر ہمیشہ اول مالک ہی کی رہتی ہے" اس کا بندوبست ہمیشہ استمراری ہوتا ہے"

ــــ یار میرے! اُس کی کیا کیا باتیں لکھوں، خط بہت طویل ہو گیا، مگر ؎

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

تو تمھارے لئے تو افسانے کا کافی مواد یوں ہی اکٹھا ہو گیا، البتہ یہ خط کے منتشر خیالات ہیں، تم ان کو اپنے ڈھنگ سے مرتب کر لو۔ چلتے چلتے میں تم کو صبیحہ کی آخری ملاقات کا ایک واقعہ سناؤں، بی اے کے امتحانات قریب تھے، میں نے بڑی پابندی سے نماز پڑھنا شروع کر دی تھی، صبیحہ کو بھی میری اس موسمی عبادت کی اطلاع ہو گئی، مسکرا کر پوچھا "سنا ان دنوں بڑے زوروں پر دعا خوانی ہو رہی ہے، کیا یہ محض امتحان کے نتیجہ کے لئے ہے؟"

ــــ "وہ تو میں نے تمھاری دعا کے سپرد کر دیا ہے، میں نے ہنس کے اپنی خفت

چھپائی، اور اُسے چھیڑنے کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ "میری تو اللہ سے بس ایک دعا ہے ؎

اک تم مجھے نصیب، تمہیں دو جہاں نصیب

یکبارگی کھل کر بولی "میری دعا کے سپرد جو کام ہے، وہ تو انشاءاللہ ہو کر ہی رہے گا، میں زبان سے نہیں، دل سے دعا کرتی ہوں" یہ کہکر وہ دفعتاً خاموش ہو گئی، جیسے کوئی بات اُس کی زبان پر بے تحاشا آنا چاہتی ہے، مگر اُسے ادا کرنے کے لئے اُسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے ہیں، وہ اپنی اُنگلیوں کے گرد، اپنا آنچل لپیٹتی، اور کھولتی رہی، اور میں ہمہ تن گوش بنا، اُس کے بقیہ فقرہ کو سننے کے لئے، خاموش کھڑا اُس کا منہ تکتا رہا۔ اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں، زیر لب مسکرائی، اور رُک رُک کر کہنے لگی "آپ کی..... دعا..... قبول ہو..... یا..... نہ ہو..... یہ تو.....آپ کے..... اور صرف..... آپ کے..... مانگنے کے..... طریقہ پر..... منحصر ہے" ـــــ دراصل اُس کی دُعا دل سے تھی، اور میری شاید زبان سے، ورنہ میں اُس پیکر وفا کو کھو کر آج کیوں اپنی تقدیر پر روتا۔

"حقیقت میں جو دنیا تھی، وہ دنیا لٹ گئی اپنی
فقط اک نام ہی کو رہ گئی ہے زندگی اپنی

حرماں نصیب
صبیحہ کا ممتاز

مجروح کلائی

آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے، بجلی چمک رہی تھی، بوندیں پڑ رہی تھیں، اور ٹرین اس خوفناک اندھیرے کو انجن کی تیز روشنی سے چیرتی، اسٹیشن پر اسٹیشن چھوڑتی اڑی جا رہی تھی —— کسی اسٹیشن پر رکی — اور دفعتاً ڈبہ میں آواز آئی "قدیر صاحب!"

"کون ہے؟ کہتے ہوئے کوئی صاحب اوپر کی برتھ پر چونک اٹھے"۔

"دوسرے سکنڈ میں کوئی زنانی سواری آپ کو بلا رہی ہے، وہاں کوئی صاحب گھس آئے ہیں" قلی کھڑکی میں سر ڈالے ہوئے کہہ رہا تھا —— حلیم کی آنکھ بھی کھل گئی —— قدیر فوراً چلے گئے —— کچھ دیر ہوئی، کچھ شور سنائی دیا، پھر بادو باراں کی طرح، گرد و پیش سے بے خبر، ٹرین اپنی راہ پر گام زن ہو گئی —— حلیم نے دیکھا قدیر پلیٹ فارم پر ایک نقاب پوش خاتون کے ساتھ کھڑے ہیں، اسے فکر ہوا، یہ کیا واقعہ ہے، قدیر کا سامان اس ڈبہ میں بہت تھا، خیال ہوا شاید زنانی سواری کے ساتھ دوسرے ڈبہ میں بھی کچھ سامان رہا ہو، جو ان لوگوں کے اس طور پر اچانک چھوٹ جانے وہاں پڑا رہ گیا ہو —— گاڑی بھاگی جا رہی تھی، اور حلیم کے خیالات بھی اس کے ساتھ جیسے دوڑ رہے تھے — بارے دوسرا اسٹیشن آ گیا، گاڑی رکی، حلیم دوڑ کر اس ڈبہ پر پہنچا، وہ ڈرا ہوا اندر داخل ہی ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ایک حسین دوشیزہ پر

پڑی، جو برقی لیمپ کے ٹھیک سامنے بقعۂ نور بنی بیٹھی تھی اور اُس کے بال پنکھے کی تیز ہوا سے اڑ رہے تھے ـــــ اس نے دفعتاً نقاب برابر کی، اور حلیم یکبارگی ٹھٹک گیا ـــــ

"معاف کیجئے" اب حلیم کھڑکی کے پاس آکر بولا "پچھلے اسٹیشن پر تدبیر صاحب کے ساتھ ایک زنانی سواری جو چھوٹ گئی ہے، کیا آپ بھی ان کی ہم سفر ہیں؟"

"جی ہاں"

"یہ کیا واقعہ ہوا؟"

"کیا عرض کروں" لڑکی اب اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی اور حلیم ہمہ تن گوش تھا، وہ ابھی کچھ کہہ نہ سکی تھی کہ ٹرین نے سیٹی دی اور حلیم نے خاموشی سے پوچھا "یہاں آپ کے پاس کوئی بیش قیمت سامان تو نہیں ہے؟"

"نقد اور زیور میرے ساتھ پچیس ہزار کا ہے" اسی سرگوشی میں لڑکی نے نقاب سے جواب دیا ـــــ حلیم کھو گیا، گاڑی چھوٹ گئی ـــــ

"آپ یہاں ڈریں گی تو نہیں؟" اس سے زیادہ وہ کچھ کہہ نہ سکا ـــــ قوتِ فیصلہ معطل، اور پیر اُس کے جم گئے تھے ـــــ وہ خلا میں، ساکت، جامد، تاک رہا تھا۔

"آپ اسی ڈبہ میں آجائیں تو بڑی عنایت ہو" لڑکی کی باریک آواز سنائی دی ـــــ اور وہ ایک معمول کی طرح اس ڈبہ میں داخل ہو گیا ـــــ مگر اب وہ ڈبہ اُسے عورتوں سے بھرا معلوم ہوا ـــــ وہاں وہ اکیلا مرد تھا، ہراساں، اور بے چین، جیسے مردوں کے مجمع میں کوئی پردہ نشین خاتون دھوکہ سے بے نقاب آجائے ـــــ ان دونوں کا تنفس چل رہا تھا، اور گاڑی ہل رہی تھی، ورنہ سارا ماحول بالکل خاموش تھا، لڑکی نقاب میں بند، حلیم اپنے خیالات میں گم ـــــ مگر خاموشی اور بھیڑ ٹوٹ کر بند

ہو جائیے تو اُس میں گُھس بیٹھ جاتی ہے، یہ خاموشی اس کے دماغ کو بہ مانے لگی ——

"آخر یہ کیا صورت ہوئی ؟" اُس نے کھلی ہوا میں سانس لینے کی کوشش کی، اور دروازہ کے قریب ہی گوشہ میں بیٹھ گیا، جیسے دراصل ڈبہ دروازہ تک بالکل ٹھسا ہوا تھا۔

"ہم لوگ اس وقت لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوہ جا رہے ہیں" لڑکی نے حلیم کی ذہنی اُلجھن دور کرنے کی غرض سے واقعات کو تفصیل سے بیان کرنا شروع کیا۔

"مراد آباد میں جب ہم لوگ اس ڈبہ میں آئے تو اس میں دو پردہ نشین خاتون پہلے سے موجود تھیں، چچا سامان کا زیادہ حصّہ لے کر دوسرے سکنڈ میں چلے گئے، میں اور والدہ یہیں بیٹھ رہیں —— بریلی پر وہ دونوں خواتین اتر گئیں، پھر پچھلے اسٹیشن پر ایک نوجوان، نشے میں دُھت، یہاں گُھس آیا —— ہم لوگوں نے اس کو بہت سمجھایا، رات کا وقت ہے، اس ڈبہ میں تنہا پردہ نشین عورتیں ہیں، یہ زنانہ درجہ ہے —— مگر وہ اپنی ہی ہانکتا رہا، سکینڈ میں کوئی زنانہ درجہ نہیں ہوتا، جب وقت آئے گا، زنانہ سکینڈ نہیں، زنانی ٹرین بنا لیجئے گا....."

"ان فوجیوں کا حال نہ پوچھئے، جو کہیں، جو کریں، کم ہے"

"فوجی نہیں، کوئی خوش باش قسم کا رئیس زادہ تھا، مخمور و مدہوش" لڑکی نے اس واقعہ کی مزید صراحت شروع کی۔ "خیر والدہ نے چچا کو بلایا، کچھ دیر ان دونوں میں جھک جھک ہوئی، پھر وہ لوگ اسٹیشن ماسٹر کے یہاں چلے گئے، وہ نوجوان کہیں اور بیٹھ گیا، مگر چچا نے ہم لوگوں سے لوٹ کر کہا، اس تنہائی سے زنانہ انٹر کی بھیڑ اچھی، تم لوگ بہتر ہے وہیں چلی جاؤ، ورنہ جانے رات میں پھر کیا اتفاق ہو —— والدہ اُتر گئیں، میں اتر رہی تھی کہ ٹرین چھوٹ گئی، چچا نے والدہ کو پھر اسی ڈبہ میں چڑھانے کی کوشش کی، مگر جسم پر نقاب، گود میں بچہ، وہ نہ چڑھ سکیں اور ٹرین تیز ہو گئی —— گارڈ نے نقاب پکڑ کر کھینچ لیا کہ وہ کہیں گر نہ جائیں ——"

"واقعی ایک عجیب صورت پیش آئی!" حلیم نے اُسے تسلی دینا شروع کی "مگر آپ گھبرائیں نہیں، انشاءاللہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی، میں آپ کے چچا کے ڈبہ میں بیٹھا ہوں، وہاں آپ کا سامان میری نگرانی میں محفوظ رہے گا، ان کا منی بیگ میں نے بستر سے اُٹھا لیا ہے، وہ یہ ہے، آپ اسے رکھ لیں، اور بہتر ہوگا کہ آپ آئندہ اسٹیشن پر اپنے زیورات کے بکس کے ساتھ، اپنے چچا کی خواہش کے مطابق، زنانہ انٹر میں چلی جائیں، وہاں آپ آرام سے رہیں گی ——"

لڑکی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی، یا اس وقت وہ کچھ سوچ ہی نہ سکتی تھی —— تھوڑی سی گفتگو، پھر اچانک خاموشی، جیسے بجلی، جلتی جلتی یکبارگی فیوز ہو گئی، بالکل اندھیرا ہو گیا، دم گھٹنے لگا —— ایسی تاریکی میں، اپنے وجود کے احساس کو برقرار رکھنے کے لئے، کبھی کبھی آدمی خود ہی بولنے لگتا ہے ——

"میں اس وقت بنارس جا رہا ہوں" حلیم نے اپنے آپ کہا "مگر میں کل صبح آپ کے ساتھ لکھنؤ اُتر جاؤں گا، اور آپ کے چچا کے وہاں پہنچنے تک آپ کی اور آپ کے سامان کی نگرانی کروں گا ......"

"آپ کی عنایت کا شکریہ" لڑکی اب شاید اپنے حواس جمع کر چکی تھی ——

اور حلیم نے محسوس کیا کہ بجلی پھر روشن ہو گئی —— مگر اب اس نے گفتگو جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا کہ مبادا اس کے خیالات اور لڑکی کے نقاب سے پیدا ہونے والا تاریک ماحول اس کا دم پھر نہ گھونٹ دے ——

"زمانہ نازک، اور پُرفریب ہے، عام طور پر لوگ، ایسی حالتوں میں، ہمدردی کی شکل میں دغا کرتے ہیں —— اور میں بھی آپ کی نگاہ میں ایک عام انسان ہوں ...."

"جی نہیں، لڑکی نے اچانک بات کاٹی "بالکل خاص!"

"آپ کے حسن ظن کا شکریہ!" حلیم نے اخلاق کا جواب اخلاق سے دیا "یہ ٹرین ہے،

چلتی پھرتی، یہاں لمحہ دو لمحہ کی ملاقات کی خصوصیت ہی کیا!"

"ٹرین ہی نہیں" آپ سے مکان پر بھی ملاقات ہوئی ہے" لڑکی شاید مسکرا رہی تھی۔ اور دفعتاً اندھیرے نے حلیم کو پھر گھیر لیا ____ مگر ابھی اس کا دم نہیں گھٹ رہا تھا، اس نے عادت کے موافق آنکھیں بند کر لیں، اور تاریخ کا ایک سوال حل کرنے لگا ____ اپنی تیس سالہ زندگی کے اوراق تیزی سے اُلٹ ڈالے، بعض ورق عرصہ سے اُلٹے نہیں گئے تھے، وہ کہیں کہیں چپک گئے تھے، ان کو بھی وہ سہولت سے کھولتا گیا ____ مگر نہیں یہ چیز اس کی تاریخ میں نہیں تھی، اس کو دھوکہ نہیں ہو سکتا، وہ تو اس میں یاد رکھتا ہے، کوئی چہرہ، کوئی واقعہ وہ کبھی بھولا نہیں، خواہ ایک ہی مرتبہ دیکھا یا سنا ہو ____ اور پھر لڑکی ____ اُس نے لڑکیاں دیکھی ہی کتنی تھیں ____ گنی گنائی، ان میں سے کسی کو بھی اس نے کبھی یاد رکھنا نہ چاہا پھر بھی کوئی دیکھی ہوئی لڑکی جب ملی وہ فوراً پہچان گیا ____ یہ لڑکی دیکھی ہوئی نہیں ہو سکتی، ممکن نہیں!

"کیوں؟" لڑکی نے ہوشیار کیا "آپ کو کچھ شبہ ہے!"

"میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ غلط کہہ رہی ہیں" اس نے نسوانی وقار کی پاسداری کی "آپ اس وقت ضرور نقاب میں ہیں، مگر میں نے آپ کو پہلی ہی جھلک میں اچھی طرح دیکھ لیا ہے ____ اس لئے مجھے خوف ہے کہ آپ کو دھوکہ ہو رہا ہے....."

"دھوکہ، خوب، آپ جیسے حلیم کو کوئی کیا بھولے گا" لڑکی نے ایک دم سے آخیر مہرہ چل کر مات دے دی ____

گویا پُل پر دوڑتی ہوئی ٹرین، ایک خوفناک جھنکار کے ساتھ پانی میں گر گئی، حلیم کی ذہانت کا پُل یکبارگی چور چور ہو گیا ____ اب وہ خود اپنی نگاہ میں، ایک ڈھونگ تھا، جس نے اب تک کتنے ممتحن، کتنے ہم سبق، کتنے شاگردوں کو دھوکہ دیا تھا، اور سب سے زیادہ خود اپنے آپ کو ____ اُس کی تمام اول درجہ کی اسناد غلط ہیں، اس نے کبھی تاریخ میں ریسرچ

نہیں کی، وہ شاید کھیل تماشوں کی طرح کا کوئی پروفیسر ہے ——— ورنہ ایک دیکھی ہوئی لڑکی کو نہ پہچاننا کیا معنی، آج وہ نشہ میں تو نہیں ہے، یا اب وہ اس کا دماغ ہی نہیں رہا جس پر اسے کبھی ناز تھا ——— لڑکی نام بتاتی ہے، اور یہاں اس کے چہرہ کے علاوہ اسے اس کا نام بتانے والا کون ہے ——— وہ اچانک لڑکی کو گھورنے لگا شاید وہ اُس کے چہرہ میں اپنا عکس دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا نام تو اُس کی پیشانی پر نہیں لکھا ہے، مگر وہاں تو سیاہ چمکدار، نقاب حایل تھی، جس کی باریک جالی سے وہ تیز آنکھیں، شاید مسکرا کر، کہہ رہی تھیں کہ ہم مرد نہیں، عورت ہیں، ہم دھوکہ کھا سکتے ہیں، ہم دھوکہ کھاتے ہیں، مگر ہم دھوکہ دیتے نہیں، نہ اپنے آپ کو، نہ غیر کو، اس صورت میں تم کو میرے قول کو یقین کرتے ہی بنے گی ———

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اس حقیر کو کہاں دیکھا ہے؟" حلیم نے اپنا سر پانی سے باہر نکالنے کی کوشش کی کہ اس کا دم کہیں گھٹ نہ جائے۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ آپ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں، کچھ سوچکر، یا بلا سوچے سمجھے یوں ہی لڑکی نے کہدیا۔

"بے شک، حلیم نے اپنے آپ میں اچانک ایک بیداری محسوس کی وہ اگر آپ کے کسی راز کے فاش ہونے کا احتمال ہے تو آپ مجھے ہرگز کچھ نہ بتائیں، ایک مسافر مسافر ہے، اس کے کردار کی کیا ذمہ داری . . . . "

"اس سے پوری واقفیت اگر نہ ہوتی تو اس خطرہ کے باوجود میں، آپکو اس وقت یہاں ہرگز نہ بلاتی" ———

حلیم کے ذہنی اقتدار کو یہ دوسری، سنگین تر، چوٹ تھی۔ مباحثوں میں قینچی کی طرح چلنے والی زبان یکبارگی گنگ ہوگئی۔ ڈبیٹ کی ساری ٹرافیاں شاید وہ خود ہی بازار سے خرید لایا تھا، جو عام فرنیچر اور تصویروں کی طرح اس کے کمروں کی زینت تھیں ———

کوئی عقل تیز، اور کند نہیں ہوتی، کامیابی اس میں تیزی کا احساس پیدا کر دیتی ہے، حلیم کو آج یہ چیز صحیح معلوم ہوئی ـــ مگر اُس نے دماغ پر پھر زور دیا، آخر یہ وہی دماغ تو ہے جو جانے کتنوں کو نیچا دکھا چکا ہے، کیا وہ سب ہی ناکارہ تھے، یا اب اس میں خود وہ قوت نہیں رہی، یا وہ اس وقت دفعتاً معطل ہو گیا ہے ـــ بار بار کی کوشش پر بھی اسے کچھ یاد نہ آیا بلکہ اب تو وہ اپنے آپ کو بھی جیسے بھولنے لگا، اسے ذہنی ناکامی سے کبھی سابقہ نہیں ہوا تھا، یہ پہلا تجربہ تھا، بالکل اچانک، گویا کسی نے ایک دم ناک پر گھونسہ مار دیا، آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، وہ بالکل بوکھلا گیا ـــ

"اگر آپ اس معمہ کی کچھ صراحت کر دیں تو میں بے حد شکر گذار ہوں گا" وہ ابھی اپنی کھلی ہوئی شکست کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں تھا ـــ مگر اب شاید لڑکی نے کوئی رائے قائم کر لی تھی، یا اب وہ مزید راز میں رہ کر اس مختصر ملاقات کو بے مزہ نہیں کرنا چاہتی تھی ـــ وہ بولی ـــ کوئی پانچ سال ہوئے، آپ کو یاد ہے، آپ ایک صاحب کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے ـــ ان کو گردہ کی تکلیف تھی، بار بار پیشاب ہو رہا تھا، عصر کی نماز کا وقت قریب تھا، وہ اٹھنے کے لئے بے چین تھے، اور طشت پانی و پیشاب سے لبریز ـــ ان کے ملازم نے آ کر کہا "بھنگی نہیں ملا" "تو کیا یہ نماز قضا ہی ہو جائے گی؟" وہ مایوسی سے بولے ـــ اور آپ جھٹ اس طشت کو اٹھا کر باہر لئے چلے گئے ـــ وہ ہیں ہیں کرتے ہی رہے، ملازم حیرت سے منہ تکتا رہا، اور آپ نے دم کے دم میں اسے صاف کر کے وہاں لا کر رکھ دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی، یہ واقعہ مجھے یاد ہے، میرے ایک دوست کے والد محمد ہاشم صاحب مرحوم کا ہے، خوب بزرگ تھے!"

"پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اس واقعہ پر جب اُنہوں نے بڑی ندامت کا اظہار کیا تو آپ نے برجستہ کہا "حضرت! عبادت انسان کی زندگی کا جزو لازم ہے۔ آپ نے نماز

پڑھی، میں نے آپ کے پیشاب کا طشت پھینک دیا —— کیا میری یہ فروگذاشت قضائے عبادت نہ ہوتی؟ ......"

"جی ہاں، ایسی کچھ باتیں ضرور اس موقع پر ہوئی تھیں"

"کچھ نہیں، بہت کچھ —— میں رات کو جب بستر پر لیٹی تو نیند کے بجائے بہت دیر تک وہی باتیں یاد آتی رہیں —— واقعی عبادت روحانی ورزش ہی تو ہے، جسم کی طرح کردار کو مضبوط بنانا —— وقت سے نماز پڑھنا، پوجا کرنا، گرجا جانا، اور عملی زندگی ویسی کی ویسی ہی جیسی ان لوگوں کی جن کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ عبادت تو نہیں تاش و شطرنج کی جیسی کوئی تفریح ہوگی، جس سے وقت اور غم کچھ کٹ جاتا ہے۔ مذہبی عبادتیں پابندی سے ادا کرنا اور ان کی خدمت سے گریز کرنا جو ہماری مدد کے مستحق ہیں بالکل ویسا ہی ہے جیسے عہد رفتہ میں خطابات کے لالچی گورنروں کی دعوت پر دعوت کرتے تھے، اور خود ان کے گھر میں ان کے اعزا فاقے —— مگر خدا کی نگاہ تو ڈنر ٹیبل تک ہی محدود نہیں، وہ تو سینہ میں بھی اُتر جاتی ہے —— ایک ذمہ دار افسر، خوشامد سے نہیں کام سے خوش ہوتا ہے، اور خدا صرف خوشامد سے، یہ کیسے ممکن ہے؟ —— دولت، بلیک یا سپید، خطاب دلا سکتی ہے، حاجی کا خطاب بھی، مگر جنت تو نہیں خرید سکتی —— عبادت اور کاروبار میں تو فرق ہے —— آپ کے چھوڑے ہوئے یہ چند منتشر خیالات مجھے رات بھر پریشان کرتے رہے ——"

"ماشاء اللہ آپ کی یادداشت بھی بہت اچھی ہے مگر آپ ساحرہ تو نہیں ہیں؟"

"جی ہاں —— میں ساحرہ نہیں ہوں، مگر آپ کو شاید خیال نہیں کہ جب ہاشم صاحب کا دم ٹوٹا، اور ساحرہ یکبارگی ان کے پلنگ کے پاس چیخ کر دوڑی، اور وہاں بے تاب ہو کر فرش پر گرنے لگی، تو میں نے بغل کے کمرہ سے آکر اُسے پکڑ لیا —— اور آپ ڈاکٹر لوٹ کر باہر چلے گئے ——"

لڑکی اب خاموش ہوگئی، شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر آپ اپنی یاد داشت کو اب بھی قابلِ فخر سمجھتے ہیں تو لیجئے اب سے پہچان لیجئے ——

مگر حلیم کے آج سارے دعوے۔ اسی حلیم کے جس کی لمحہ بھر قبل اتنی تعریف ہوئی تھی، بالکل باطل ہو رہے تھے۔

"آپ ضرور سچ کہتی ہیں۔" حلیم نے کچھ یاد داشت اور کچھ مصلحت سے کام لے کر اس واقعہ کی تائید کی "مجھے بھی کسی لڑکی کا اس وقت کمرے میں اچانک داخل ہونا اور ساحرہ کو اپنی گود میں پکڑنا یاد آتا ہے —— مگر اول تو وہ پریشانی کا وقت تھا اور پھر شاید آپ اس وقت بھی پردہ کے انداز میں رہی ہوں گی۔ جس کی وجہ سے میں آپ کے چہرہ کو نہ دیکھ سکا ہوں گا۔" ——

—— ہم میں جب کسی خوبی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے یا کرا دیا جاتا ہے تو وہ ایک بری عادت کی طرح باوجود کوشش کے نہیں چھوٹتا —— حسن و قبح میں تکلیف اور آرام کی نسبت ہے۔ آرام میں تکلیف بھول جائے گی۔ مگر تکلیف میں آرام کی یاد ستاتی رہے گی —— گری ہوئی امارت، ڈھلتی ہوئی جوانی، بجھتی ہوئی ذہانت اپنے زوال میں بھی ایک آن رکھتی ہے۔ وہ اپنی شکست اس سے زائد تسلیم نہیں کر سکتی کہ ہم اس سے بہت اچھے تھے۔ پھر بھی آج ہزار برے ہیں۔ تو تم جیسے تو ہیں ہی —— اس طور پر اپنے معیار اور حوصلہ کی بلندی کم از کم اپنی نگاہ میں قائم رہتی ہے" اور زندگی کی قدر تیزی سے نہیں گھٹتی ——

"پردہ یا پردہ کے انداز میں تو اس وقت میں بالکل نہیں تھی۔" لڑکی کے احساس برتری کو اب تقویت ہوتی جا رہی تھی "یہ اور بات ہے کہ اتفاقی طور پر آنچل اس وقت چہرے کے اس حصے پر جو آپ کی جانب تھا۔ کھسک آیا ہو —— اور پھر یوں بھی اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ جو آپ کو یاد ہی رہتا۔" ——

کسی بلندی سے پیر پھسلنے کے بعد، ٹھہرنا مشکل ہے۔ بلندی جتنی زیادہ ہوگی۔ گرنے کی رفتار۔ اتنی ہی تیز۔ بیچ میں سہارے کے لئے جو چیز بھی پکڑی گئی وہ ٹوٹ جائے گی ــــ گرنے والا سنبھلنے کی بار بار کوشش کرکے مایوس ہوتا رہے گا ــــ یہاں تک کہ وہ زمین پہ پہنچ جائے گا۔ نیم جان اور مردہ ــــ "خیر یہ تو آپ مجھے مجبور کر رہی ہیں" حلیم اب واقعتاً خفیف ہو چکا تھا "ورنہ آپ باور کریں کہ میں نے آپ کو اس وقت قطعی نہیں دیکھا۔ اگر دیکھتا تو ہرگز نہ بھولتا" ــــ اس نے ذرا دم لینے اور اپنے الفاظ کو تولنے کی کوشش کی، مگر جیسے اس کا یہ قدم بھی کسی کائی میں دبے ہوئے پتھر پہ رکا تھا۔ جو معاً سرکنے لگا۔

"تعجب ہے" لڑکی مسکرائی "مجھے اس وقت ساحرہ کو پکڑنے کے بعد خیال ہوا کہ میں گھبراہٹ میں بالکل بے پردہ چلی آئی ہوں۔ ممکن ہے آپ پہچان لیں"۔ شاید تاریخ کا یہ دوسرا پرچہ تھا۔ مگر اب تو وہ ساری تاریخ ہی بھول چکا تھا۔ وہ تو جیسے اب خود تاریخ ہوا جا رہا تھا۔ مگر کسی ٹیڑھے سوال کا جواب سوچنے کے لئے لڑکے بھی تو اپنی طرف سے اُلٹا سیدھا سوال کرکے تھوڑا وقت حاصل کر لیتے ہیں پھر مدرس تو ان چیزوں کو اپنے فن کے جزیات میں شامل کر لیتا ہے ــــ

"مگر جب میں آپ کو اس بجلی کی روشنی میں نہ پہچان سکا تو اُن ڈوبتی کرنوں میں آنچل کی آڑ سے، اس تنگ کمرے کے گھٹتے ہوئے ماحول میں، کیا پہچانتا" ــــ اس نے سوچا جہاں ذہن جواب دے دے وہاں فن بہت کچھ کام دیتا ہے۔ آج اس کا بھی تجربہ کر لینا چاہیئے۔

"خیر، اب تو یہ عذر ہے کہ پانچ برس کے بعد دیکھا ہے۔ ۱۵ اور ۲۰ سال کے سن میں بیّن فرق ہو سکتا ہے" لڑکی نے جیسے گول مول جواب سے تنگ آکر شاگرد کے کان پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت تو تھوڑے دنوں ہی کی بات تھی ــــ"

اب حلیم کی شکست مکمل ہو چکی تھی۔ خودداری فاقوں کی شدت سے دم توڑ رہی تھی۔ حرام حلال ہو رہا تھا ـــــ حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ دم گھٹ رہا تھا ـــــ

"اب آپ مجھے فوراً بتا دیجئے کہ میں نے اس سے قبل آپ کو کہاں دیکھا تھا۔" اس کی ذہانت ایک دم سپر انداز ہو گئی اور اب وہ گویا نزع کی سی حالت میں ہانپنے لگا۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں فوراً بتاتی ہوں! لڑکی کو شاید اس کی پریشانی پر اب ترس آ گیا تھا۔ مگر ایک شرط ہے ـــــ"

اب وہ ہر شرط ماننے کے لئے تیار تھا، سوچ سمجھ اور تامل کی منزل گزر چکی تھی ـــ

"فرمایئے۔" وہ بچھڑے ہوئے پہلوان کی طرح بولا۔

"آپ میری غلطی معاف کر دیجئے۔" اب واقعی لڑکی ہنس رہی تھی۔

"غلطی اور آپ کی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کوئی افسانہ تو نہیں سوچ رہی ہیں ـــــ" گویا وہ خواب میں ایک اور خواب دیکھنے لگا۔

"آپ جو بھی سمجھیں۔" لڑکی نے اسی انداز میں کہا۔ مگر واقعات ـــــ تو آپ کو ـــــ جبھی بتائے جائیں گے۔ جب آپ میری غلطی معاف کر دیں گے۔"

اس کا پہلوان جیسا چوڑا چکلا سینہ اب بہت دب چکا تھا، دم گویا نکلنا ہی چاہتا تھا، مزید عذر کا کوئی موقع نہ تھا۔

"خیر آپ کی یہی ضد ہے۔" حلیم نے اب مکمل ہار مان لی۔ تو اگرچہ غلطی تو اس وقت سراسر میری ہے مگر چونکہ حالات جاننے کے لئے مجھے سوہانِ روح ہو رہا ہے۔ لہٰذا میں آپ کی یہ شرط مان کر آپ کو معافی دے دوں گا۔" ـــــ اس نے محسوس کیا۔ قتل ثابت ہو چکا تھا۔ پھانسی کا حکم ہوا ہی چاہتا تھا مگر بابے جج نے کوئی سفارش سن لی ـــــ

"آپ کی شادی بدایوں میں ڈاکٹر رشید کی لڑکی صفیہ سے ہوئی ہے ــــــ؟"

"جی، ہوئی تھی ــــ"

"ہوئی تھی کیوں ــــ؟" اب اس کی پریشانی یکبارگی لڑکی کی طرف منتقل ہوگئی۔ حلیم کے خیالات بٹ گئے۔ اعصاب کا تناؤ کم ہوگیا۔ اور اب اس کا سانس آرام سے آنے جانے لگا ــــ اپنی ہار مکمل ہو کر ہمت توڑتی ہے۔ مگر اپنے ہرانے والے کی ہار کے تھوڑے سے بھی آثار اپنی ٹوٹی ہوئی ہمت فوراً باندھ دیتے ہیں ــــــــــــ

ــــ" وہ غریب سال کے اندر ہی دفعتہً ہیضہ کی شکار ہوگئی"

"ہیں! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ــــ!" لڑکی پر اس اچانک خبر کا بہت اثر ہوا ــــ وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ حلیم اپنی دماغی کشمکش میں بالکل چور ہوگیا تھا وہ بھی خاموش اپنا توازن ڈھونڈتا رہا۔ وہ اس غم کے تذکرے میں کوئی حصہ نہ لے سکا۔ یہ غم پرانا ہو چکا تھا۔ تازی چوٹ، چھوٹی بھی۔ پرانی بڑی سے، زیادہ معلوم ہوتی ہے ــــ پھر موت میں انسان مجبور ہے۔ مگر زندگی میں وہ اپنی ہر قوت کے زوال میں اپنی کوتاہی اور خفت محسوس کرتا ہے۔ بوڑھے سے بوڑھا انسان بھی چہ جائیکہ جوان ــــ

"مجھے اب تک اس کی کوئی خبر نہ تھی" تھوڑی دیر کے بعد لڑکی خود ہی بولی"۔ افسوس کہ وہ کلی سال ہی بھر میں کھلی اور مرجھا گئی ــــ اس کے کیا کیا حوصلے اور ارمان تھے۔ کتنی دقتوں سے آپ اسے ملے۔ وہ بھی آپ کی والدہ بیچ میں نہ آتیں تو آپ کاہے کو اس کے پلے پڑتے ــــ اور وہ غریب یوں بات کی بات میں چل دی ــــ آپ کی زندگی یقیناً تلخ ہوگئی ہوگی ــــ"

"کچھ نہ پوچھئے"، حلیم کی انسانیت بھی اب بیدار ہو چلی تھی"۔ عجیب ستم تھی۔ بے طلب آئی اور بے تاب چھوڑ گئی" حلیم عمدہ بولنے والا تھا، زیادہ بولنے والا تھا۔

مگر اس وقت جانے وہ کیوں اس سے زائد کچھ نہ کہہ سکا۔

"تو آپ نے دوسری شادی اپنی سالی قدسیہ سے کر لی۔"

"میں تو شادی کے ہمیشہ سے خلاف ہوں۔ اور آپ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی اس کا علم ہے اس حادثہ کے بعد میں اس سے بالکل ہی پناہ مانگنے لگا۔ اتفاقاً چند ماہ بعد والدہ بھی قضا کر گئیں۔ اور اب یہ راستہ بالکل صاف ہو گیا ـــــ میں نے قطعی طے کر لیا کہ اب میں شادی نہ کروں گا ـــــ میری زندگی میری خواہش کے مطابق پرانے راستے پہ بدستور چل نکلی ـــــ پڑھنے پڑھانے میں غرق ہو گیا، اسی میں زندہ ہوں۔ اور شاید اسی میں مر جاؤں گا ـــــ" شاید ـــــ واقعی زندگی کی ساری باتیں شاید ہی ہیں۔ نپولین کو "ناممکن" کے لفظ پر اعتراض تھا ـــــ مگر شاید ـــــ اس سے تو شاید وہ بھی ڈرتا تھا۔

لڑکی خاموش تھی، اور حلیم خاموش تر ـــــ دونوں کے دماغ جانے کہاں کہاں تھے۔ اسٹیشن آیا، ٹرین رکی، پھر چل دی ـــــ حلیم جیسا بیدار ہوا تو ٹرین لائن بدل کر پھر رفتار پکڑ رہی تھی۔ وہ ایک دم ہنس پڑا کیا آدمی اپنی زندگی کے اہم معاملات میں بھی کبھی کبھی ایسا غافل ہو جاتا ہے!

"کیا میں آپ کے اس فیصلہ کی وجہ پوچھ سکتی ہوں ـــــ؟"

"کیا عرض کروں میری اُلٹی باتوں سے آپ کی طبیعت اس وقت اور مکدر ہو گی ـــــ" حلیم کی طبیعت خود اس وقت اس نظریہ کی تشریح کے لئے موزوں نہ تھی ـــــ مگر عورت بہت کم درخواست کرتی ہے۔ اور اس کا جواب نفی میں سننے پر تیار نہیں ہوتی۔

"نہیں، نہیں، آپ شوق سے فرمائیں۔" لڑکی اس کے پندارِ خودی کو مشتعل کر رہی تھی۔ "میں آپ کی ہر گفتگو کو درس سمجھتی ہوں ـــــ" اب اس کے لئے کوئی مفر نہ تھا۔

"خیر، یہ آپ کی قدر افزائی ہے ـــــ رہا اس معاملے میں میری مخالفت کی وجہ وہ اس سفر سے زیادہ طویل ہے - یوں امتثال امر کے طور پہ میں اس وقت ایک عرض کر دوں گا۔ شادی خود غرضی کا اول سبق ہے - انسان کے سارے عمدہ جذبات، جو فلاح عام کے لئے ہیں۔ شادی کے بعد دفعتاً سمٹ کر ایک عورت کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں (بشرطیکہ وہ ایک کامیاب شادی ہو)۔ اور بعد میں اس کے بچوں میں تقسیم ہو کر رہ جاتے ہیں ـــــ آپ کسی آدمی کو لے لیجئے۔ اگر وہ تنہا ہے تو آپ اسے عام طور پر اپنے عزیز، دوست، اور غیروں تک کی خدمت میں پیش پیش دیکھیں گی ـــــ مگر شادی کے بعد وہی شخص بدلا ہوا انسان ہو گا ـــــ غیر تو درکنار، دوست اور عزیز بھی اس کی توجہ سے بالکل محروم ہوں گے ـــــ خود گھر میں بیوی فرش پر اور والدہ بوریوں میں گزر کرتی ہوں گی ـــ اور اگر آپ اس سے اعتراض کریں گی تو وہ بیالوجی کے نظریے لے کر بیٹھ جائے گا ـــــ آپ خاموش ہیں۔ شاید آپ کو میری بات اُکتا رہی ہے ـــ؟"

"جی، نہیں میں ہمہ تن گوش ہوں۔ پروفیسر بول رہا ہے۔ شاگرد کی طرح میں سن رہی ہوں"

"تو میں انسانی زندگی کے مقاصد کو بہائم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ محض ترقی نسل انسان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ نہیں ہو سکتا ـــــ مگر فی زمانہ کیا مرد، کیا عورت، سب ہی نے اپنی نفسانی زندگی کو ہی حاصل زندگی سمجھ رکھا ہے ـــــ اور اس میں اس طور سے گم ہیں کہ ان کی ساری دنیا صرف اپنی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اور وہ چار دیواری بھی ہر آئندہ نسل کے ساتھ تنگ تر ہوتی جا رہی ہے ـــــ ایسی صورت میں جو کچھ بھی میں اپنی بساط کے مطابق خدمت خلق کر سکتا ہوں اس کے راستے میں عمداً شادی کا روڑا نہیں اٹکانا چاہتا ـــــ"

"آپ کا خیال بجا ہے - ایک ماہر وکیل کی طرح لڑکی نے اس کے اعتراض کی قوت تسلیم کر کے خوش اسلوبی سے اس کی تردید شروع کی" مگر سوال یہ ہے کہ یہ حل انفرادی ہے۔ یا اجتماعی، انفرادی ہے، تو خودکشی، جو ایک مرد کے شایان شان نہیں" اور اجتماعی ہے تو خلقت کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا، جس کی خدمت کا سوال اٹھا ہو ——— اور پھر کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟

"ضرور" اب حلیم جواب سے، ماحول سے، یا جانے کیوں کچھ ڈھیلا معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا عورت اور مرد کی زندگی بجائے خود نامکمل نہیں ہے، جو ایک دوسرے سے مل کر ہی ایک مکمل زندگی بنتی ہے ———؟"

"اس سے انکار نہیں" یا تو انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی، یا انکار سے وہ بحث کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔

"تو پھر ایک نامکمل زندگی، ناقص مشین کی طرح، پورا کام کیسے کرے گی؟"

"لیکن مشین کے پرزے اگر ردوبدل ہو کر غلط لگ جائیں تو کیا ہو گا ——؟" حلیم نے اعتراض کیا۔

"مشین فیل ہو جائے گی ——" لڑکی نے برجستہ جواب دیا —— حلیم ہنس پڑا۔ لڑکی بھی ہنس پڑی ——— یعنی یہ بات تو ہے مگر ویسے نہیں جیسے آپ سمجھ رہے ہیں ——— اس نے کہا۔

"تو آپ کی دقت دراصل مناسب پرزے کی تلاش ہے۔ جو آپ کی مشین میں رکاوٹ نہیں، روانی پیدا کرے"

"مگر ایسے پرزے کی جستجو، تحقیق، اور تصدیق ہی، میری مختصر زندگی کا کل وقت لے گی" گویا یہ حلیم کا مسکت جواب تھا ——— اور واقعتاً لڑکی اب بالکل

خاموش ہوگئی ـــــ جیسے طوفان کی آمد سے قبل ایک خوفناک خاموشی ـــــ اور حلیم کو تھوڑا اطمینان ہوگیا ـــــ مگر آئندہ اسٹیشن ابھی دور تھا ـــــ حلیم نے پھر گفتگو کی ابتدا کی ـــــ

"ایک ذراسی ملاقات میں آپ میری ساری زندگی کا مسئلہ کہاں طے کریں گی۔ اب آپ وعدے کے مطابق اپنے چہرے سے گمنامی کا پردہ اُٹھائیں تو نوازش ہو۔"

"بلقیس ـــــ!" ایک دھیمی سی آواز نقاب میں سنائی دی۔

"شاہد صاحب کی صاحبزادی ـــــ؟" حلیم چونک پڑا۔

"جی ـــ"

"میرے کان ابھی تک درد کر رہے ہیں" حلیم کے دونوں ہاتھ خود بخود کان پر اُٹھ گئے۔ جیسے واقعی کوئی اسے مروڑنا چاہتا تھا۔

"میں پہلے ہی اس گستاخی کی معافی مانگ چکی ہوں ـــ" لڑکی اب سرنگوں تھی ـــ گویا ؎ ـــــــــ

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

دھوکہ کی معافی کی نہیں!" حلیم ہنس رہا تھا۔

"جرم بھی تو دھوکہ ہی کا تھا۔ پھر شادی میں تو سہیلیوں کا یہ حق بھی ہے ـــ" لڑکی نے ہنسی کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

حلیم نے طنز کی ؎

شوق تھا تیغ آزمائی کا

کہیئے کیا حال ہے کلائی کا

"وہ تیرا کان نہیں" لڑکی نے کہا ـــ مضبوط کلائی ہے، اسے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" حلیم کا چہرا یہاں بھی کچھ بیتا ہی نظر آیا۔ مگر اب اس کی

طبیعت کا رنگ جیسے یکبارگی بدل گیا، وہ اب بالکل شگفتہ تھا۔ شاید اس کے مردہ جذبات میں کوئی نئی روح داخل ہوگئی تھی۔ اور اب وہ اس بلندی پہ پہنچ گیا تھا، جہاں اپنی قدر خود ستائی سے نہیں، معذرت خواہی سے بڑھتی ہے ——

"آپ شاید یقین نہ کریں، مگر جب صفیہ نے مجھ کو بتایا کہ اپنا کان چھڑانے میں جو آپ کی کلائی میرے ہاتھ میں آگئی تو آپ کی چوڑیاں، ٹوٹ کر اس میں ایسی دھنسیں کہ وہ پوری کی پوری کلائی بری طرح زخمی ہوگئی، تو مجھے انتہائی ندامت اور ملال ہوا۔ یہ پہلی کلائی تھی جو میں نے کسی لڑکی کی پکڑی، اور اس میں ایسا ناکام رہا۔ میرا برجستہ جی چاہا کہ آپ کے یہاں حاضر ہو کر معافی مانگوں، مگر معلوم ہوا کہ آپ مراد آباد جا چکی ہیں۔" حلیم یہ سب کچھ ایک سانس میں کہہ گیا۔

"پھر بھی آپ مجھے پہچانتے نہیں،" بلقیس نے طنز کی۔

"کیسے پہچانوں،" حلیم نے اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی "جب آپ ہلال تھیں، اب بدر ہیں، اس وقت جھلک نظر آئی تھی، آج خیرہ کر دینے والی تڑپ دیکھی، جب آپ ٹھٹولی کرتی تھیں، اب آپ مباحثہ کرتی ہیں، اس وقت آپ ٹٹی سے شکار کھیلتی تھیں، اب آپ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بس، بس،" بلقیس نے دفعتاً بات کاٹی "آپ ایک حقیر لڑکی سے گفتگو کر رہے ہیں، ڈبیٹ میں تقریر نہیں، یہاں چیرز اور تمغے کہاں۔ میں اتنی سرپھری نہیں ہوں، من آنم کہ من دانم —— آپ کی ذرہ نوازی کا شکریہ!"

اس گفتگو سے حلیم کے بھولے بسرے خیالات جیسے جاگنے لگے۔ اور اب وہ اپنی عادت کے خلاف اس لڑکی سے بات کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کر رہا تھا۔

"بلقیس! تمہارا بی۔ اے کا نتیجہ نینی تال میں دیکھ کر جو خوشی مجھے ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا، جی چاہا فوراً ایک مبارک باد کا تار تم کو دوں، مگر خیال ہوا

ذراسی شادی کی ملاقات، وہ بھی تلخ، تم بھول بھلا گئی ہوں گی ۔ پھر پتہ بھی ٹھیک نہیں معلوم تھا ۔ تاجروں کا کیا، آج یہاں، کل وہاں، اور پھر اس ہڑبونگ میں نہ جانے کہاں — آخرش میں نے شاہد صاحب کے نام ایک مبارک باد کا خط مراد آباد لکھ دیا، جواب نہ آیا، خیال ہوا نہ پہنچا ہوگا ۔ معاف کرنا، غلط فہمی کے خیال سے تم کو براہ راست نہیں لکھا، مجھے معلوم تھا تمہارے والدین پرانے خیال کے لوگ ہیں . . . . "

"بہت بہت شکریہ" کہتے ہوئے بلقیس نے خاموشی سے اپنے زیور کا بکس کھولا ۔ "یہ رہا آپ کا خط" ۔ وہ اس کو دینے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھی ۔ اور چلنے میں اس نے نقاب اُلٹ دی ۔ حلیم نے فوراً کھڑے ہو کر خط تھام لیا ۔ جیسے وہ اس کے خط کا جواب تھا ۔ اور واقعتاً اس پر سرخی سے کوئی ریمارک تھا ۔

" FROM
MY HERO TO WHOSE INSPIRATION
OWE MY ALL — " BILQUIS "

"میرے ہیرو کے قلم سے جو میری کامیابی کا اصل محرک ہے، بلقیس" ۔

حلیم یکبارگی گہرے سکوت میں پڑ گیا ۔ خط شاہد کے نام، تحویل میں بلقیس کے، برآمد کی زیور کے بکس سے، غائبانہ یہ نوٹ ۔ یہ صورت، یہ سیرت، یہ عقیدت ۔ کیا کہوں، کیا کروں، کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی — اس کا دماغ اب پھر بالکل معطل ہو گیا — صرف زبان سے وہ کچھ بات چیت جاری رکھ سکتا تھا ۔

"بلقیس! یہ محض تمہارا حسن عقیدت ہے، ورنہ حقیقتاً یہ خود تمہارے چھپے ہوئے جوہر کا کرشمہ ہے" ۔

"جو بھی ہو" اب بلقیس نیچی نظر کئے گفتگو کر رہی تھی، "مگر میرے جذبات

میں تحریک اور میرے ارادہ میں تقویت پیدا کرنے والی آپ کی وہی تقریر تھی جو آپ نے ہاشم صاحب کے یہاں اس روز لکھنؤ میں کی — میں نے اسے اُسی وقت اپنے لئے ہدایت عمل بنالیا اور سچے دل سے تہیہ کر لیا کہ میں بھی اپنی زندگی اسی سانچے میں ڈھالوں گی — میں نے اپنے پرانے خیالات کے کنبہ میں رہ کر اپنی تعلیم کی جوں توں تکمیل کی — آپ کی زندگی کا نمونہ ہمیشہ پیش نظر رکھا، میں خود بھی تعلیم ہی کے ذریعہ خدمت خلق کرنا چاہتی ہوں، مگر اس میں کچھ رکاوٹیں ہیں — "

"کیا تم اس پر حاوی نہیں ہو سکتیں ؟"

"دیکھئے، کوشش تو کر رہی ہوں، آخر، پرانے خیالات کے ایک مسلم کنبہ کی لڑکی جو ٹھہری — " بلقیس نے اپنی گفتگو تشنۂ تکمیل چھوڑ دی —

حلیم نے اس کی ہمت افزائی کے طور پر کچھ کہنا چاہا، مگر اس کی نگاہیں اُٹھتے ہی بلقیس کی اُمڈی ہوئی آنکھوں سے متصادم ہو گئیں، اور دفعتاً اس کے دماغ کے ساتھ اس کی زبان بھی اب مفلوج معلوم ہونے لگی — اس کے دل و دماغ میں کچھ عجیب سی ہلچل مچ گئی، معلوم ہوا ساری تاریخ، فلسفہ اور نفسیات جیسے یکبارگی اس کے دماغ سے محو ہو گئے — اس کو مرفٹ وال پول کا یہ قول یاد رہ گیا کہ "ہر آدمی کی ایک قیمت ہے"۔ یعنی آدمی کا ارادہ، کتنا ہی مستحکم اور مضبوط ہو، وہ صرف ایک قیمت کا محتاج ہے، جب وہ لگ جائے گی وہ معاً بک جائے گا — اگر کوئی ارادہ قائم رہ گیا تو وہ ایک ایسی کنواری ہے جس کا کوئی معقول گاہک نہ مل سکا — ان خیالات کی یورش میں اس نے پھر اپنی متزلزل ارادی قوت کو مجتمع کر کے اسے مستحکم کرنے کی کوشش کی — ہر ڈکٹیٹر ہتھیار رکھنے سے قبل یہ ایک بار ضرور کرتا ہے — مگر اب اس کے خیالات کی فوج میں جیسے بدامنی

پھیل چکی تھی، سب اپنی اپنی راہ پر جا رہے تھے، بالکل گمراہ، اور اب وہ خود بھی تو گمراہ ہو رہا تھا — کھوئی ہوئی حالت میں اسے خیال آیا کہ بلقیس ابھی وہیں کھڑی ہے — خط پر نگاہ پڑی تو دیکھا کہ وہ اُس کے اپنے ہاتھ میں! قلب کی تیز حرکت کے ساتھ تھرا رہا ہے — گھبرا کر اس نے بلقیس کی طرف نگاہ اُٹھائی — وہ اب نیچی نگاہ سے خط کی لرزش دیکھ کر مسکرا رہی تھی — حلیم نے دیکھا راز فاش ہو گیا، سلطنت جا رہی ہے تو حوصلہ کی فیاضی دکھا کر کیوں نہ اپنی گرتی ہوئی ساکھ قائم رکھی جائے — بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلا "بلقیس! کیا وہ مجروح کلائی آج میں تمہاری اجازت سے پکڑ سکتا ہوں؟"

———— ∴ ————

پاک دامن

یونیورسٹی میں اُسے ایک نئی، بالکل نئی، زندگی کا احساس ہوا۔ مکان، اسکول، کالج سے یکسر مختلف۔ گرلز اسکول، اور گرلز کالج، خود اُس کے مکان کی اک ذرا بڑی شکل تھی، کشادہ کمرے، بلند دیواریں، وسیع صحن۔ مگر پڑھنا لکھنا، کھیلنا، کودنا، بحث مباحثہ، یہ سب کچھ لڑکیوں ہی میں ہوتا تھا۔ خود استانیاں بھی اس ہی جیسی کچھ بڑی لڑکیاں تھیں۔ ان اداروں میں پڑھنے کے زمانے میں اُس کا داخلی اور خارجی ماحول اپنے گھر کا سا رہا —— مگر یونیورسٹی کی تو دنیا ہی کچھ اور تھی، نئی زمین، اور نیا آسمان —— فریدہ کو اس اچانک تابناکی سے چکاچوند ہونے لگی —— پہلے وہ کچھ سہمی، اور گھبرائی، پھر اس نے ہولے ہولے، اپنے گرد و پیش کو غور سے دیکھنے کے لئے رنگین عینک لگانی شروع کر دی —— کچھ دنوں تک اُسے لڑکوں کے مقابلہ میں کمتری کا احساس ہوتا رہا، وہ اُس کی مدافعت کی روز افزوں کوشش کرتی رہی —— اسی دوران میں سہ ماہی امتحان ہوا۔ وہ اُس میں اول آئی، پھر ٹینس کے انٹر یونیورسٹی ٹورنامنٹ ہوئے اس میں اُس کو تمغہ ملا —— پے در پے یہ واقعات اس طور پر پیش آئے کہ فریدہ کے احساسات میں یکبارگی تبدیلی پیدا ہوگئی۔

وہ فطری طور پر شوخ اور چنچل تھی۔ اب یونیورسٹی کی فضا نے اس پہ اور بھی جلا کر دی، وہ تیزی سے اپنا پس منظر بھولنے لگی، حال کی رنگینیاں ماضی کی تلخیوں پہ غالب آنے لگیں، خیالات کی تازگی نے زندگی میں دل کشی پیدا کر دی، تو ہمات کی دنیا مسما۔

ہو گئی، اور حقیقی دنیا کی دلآویزیاں اُفق پر نظر آنے لگیں —— ماں باپ کا بارہ سال پرانا غم وہ اب رفتہ رفتہ بھولنے لگی، البتہ اپنے عزیزوں کی چیرہ دستیاں اس کو اب بھی، کبھی کبھی یاد آجاتیں ——، اس کی کم سنی سے فائدہ اُٹھا کر اس کے سوتیلے عزیز اس کا سب کچھ، گھن کی طرح چاٹ گئے تھے، —— اب اپنے والدین کے ترکہ میں صرف وہ خود باقی رہ گئی تھی —— بہترین متروکہ —— علم، ہنر، سلیقہ، اور ان سب سے زیادہ، اس کی شوخی نے اُس کے حُسن میں بلا کی دل آویزی پیدا کردی تھی —— لڑکپن میں بھی شوخیاں تھیں، مگر جوانی تو بس اک بلا ہو گئی — ہاں بلا۔ بے شک بلا، اور وہ اس گرداب بلا میں مہارے کی جستجو کرنے لگی ——

اس کے عزیز، وہی گندم نما جو فروش عزیز، اس گوہر گراں مایہ سے پوری طرح فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے اس کا سب کچھ شیر مادر کی طرح ہضم کر چکے تھے۔ تو پھر اس کو کیوں چھوڑ دیتے ۔ حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بہ قدرِ وسعت —— وہ لوگ، اس وقت، اپنی غرض سے، فریدہ کی خوبیوں کی تعریف۔ حقیقت، مبالغہ اور غلو کے ساتھ ہر چہار طرف، نہایت منظم طریقہ پہ کر رہے تھے، اس طرح اس کے طلبگاروں کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہو رہا تھا —— زیادہ تر پیغامات والدین کے ذریعہ روایتی طور پہ آئے، کچھ نے خطوط لکھے، اور بعض نے خود فریدہ کو زبانی پیغام دینے کی کوشش کی —— غرض ہر ایک نے اس سلسلہ میں، اپنی اپنی پوری جدو جہد کی، اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا —— مگر یہ فریدہ کے ترکہ کا نہیں، خود اس کی تمام زندگی کا، سوال تھا —— وہ اس وقت جوش نہیں، بالکل ہوش سے کام لے رہی تھی —— اس کا کوئی اپنا نہیں تھا، وہ صرف خود ہی اپنی تھی۔ جو علم، جو عقل، جو تھوڑا بہت زندگی کا تجربہ اُس کو حاصل تھا وہ اسی پر بھروسہ کر رہی تھی —— اُس نے عزیز و اقارب، دوست، احباب، سب کی آواز پر،

کان بند کر کے، اپنے دل کی، بلکہ اپنے دماغ کی، آواز سننے کی کوشش کی —— اور اُس نے اپنی زندگی کے ساتھی کے لئے ارشد کو منتخب کر لیا —— کیوں، کس لئے، کسی کو معلوم نہیں، ہر امیدوار مایوس، ہر عزیز ناراض تھا —— ارشد اور فریدہ کا کوئی جوڑ بھی ہے، وہ ایک وکیل کی لڑکی ہے۔ سرکاری وکیل کی، ماں باپ مر چکا، اس کی امارت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے، پھر بھی اُس کا سایہ تو ابھی باقی ہے۔ وہ اب بھی ہزاروں سے بہتر ہے، شادی میں خاندانی حیثیت کا خاص مقام ہے۔ صرف بی اے کے امتحان میں اول آنے سے، راتوں رات ایک کلرک کا لڑکا بڑا آدمی تو نہیں ہو جاتا —— ملازمت کے لئے مقابلہ کے امتحانات میں بھی ان باتوں کا خاص لحاظ ہوتا ہے —— حالات آدمی کو بڑا بناتے ہیں، اور حالات بدلتے، بدلتے، بدلتے ہیں —— مگر نہیں، فریدہ تو اپنا فیصلہ کر چکی تھی، وہ بہت دکھ اُٹھا چکی تھی، وہ زندگی میں اب سکون و اطمینان تلاش کر رہی تھی، وہ عیش کی دیوانی نہیں تھی، ماں باپ کا پیار اس کو نہیں ملا تھا، اور نہ اب وہ اُسے مل سکتا تھا، وہ اس کمی کو شوہر کے پیار سے پورا کرنا چاہتی تھی —— اونچے طبقہ کو اُس نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا، اُس کو اوسط درجہ کی زندگی پسند تھی —— نام و نمود کم، سکون زیادہ ——

اُس نے ارشد کے علم، وقار، اور سلامت روی میں اپنا سکون تلاش کیا، اور وہ خوش تھی، بہت خوش، بے حد خوش، کہ اس نے اپنی زندگی کے لئے معقول پناہ ڈھونڈ لی ہے —— ارشد اپنی جگہ خوش بھی تھا، اور متحیر بھی، اس کا تحیر زیادہ تھا، یا خوشی، یہ شاید خود اُس کو بھی نہیں معلوم تھا —— وہ تو فریدہ کے اس اچانک فیصلہ سے بالکل بوکھلا گیا —— جیسے کسی ملازمت کے لئے نہ درخواست، نہ سفارش، نہ انٹرویو —— اور یکبارگی پروانہ تقرر آجائے

—— حسن، دولت، علم، وجاہت کی تائید کے ساتھ کتنے ہی نوجوان فریدہ کے خواستگار تھے۔ مگر شاید ان سب میں کوئی خاص کمی تھی جو اُس کو ان سب پر فوقیت حاصل ہوئی —— ارشد ایک احساس برتری میں مبتلا ہو گیا۔ اور اُس کے ہم چشم اپنی ہزیمت کی تلخی سے تلملا اُٹھے —— اُنہوں نے ابتک ارشد کو ایک نادار طالبعلم کی حیثیت سے دیکھا تھا، جو ان سے نصاب کی کتابیں مستعار لے کر پڑھتا تھا۔ جس کی فیس پروفیسر اپنی جیب سے داخل کرتے تھے، جو امتحانات میں، ہمیشہ اول دوم آنے کے باوجود، اپنی بدحالی کی وجہ سے، درجہ میں کبھی اگلی سیٹ پر نہیں بیٹھتا تھا —— آج وہی ارشد، حقیر ارشد، کم مایہ ارشد، ان سب کو اس مقابلہ میں بھی شکست دے گیا تھا —— اور وہ بھی اس طرح کہ اُس نے خود فریدہ کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی —— گویا بن مانگے موتی ملے اور مانگے ملے نہ بھیک —— یہ اُن سب کے زعم باطل کی شدید توہین تھی، شدید ترین —— آج یہ لوگ اُس سے سرراہ اس طرح کترا کر گذرتے جیسے کبھی خود ارشد ان خوش پوش، خوش باش، لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولی سے، اپنے احساس کمتری کے تحت، دب دبا کر نکل جاتا تھا —— اب ارشد میں برتری کا احساس روز بروز ترقی کرنے لگا، یہ احساس بالکل یکبارگی آیا تھا، اُس کی شدت کا وہ متحمل نہ ہو سکا، اور اپنا توازن کھو بیٹھا —— شاید کچھ عرصہ میں، یہ ردعمل کی کیفیت گذر جاتی، اور وہ اپنا توازن واپس پا جاتا۔ مگر دفعتہً وہ حالات اور واقعات کے ایک عجیب چکر میں گھر گیا —— جتنے منہ، اتنی باتیں، وہ کس کس کی سنتا، کس کس کو جواب دیتا، اس کا سارا قدامت پسند ماحول اس پر ہنس رہا تھا، طنز کر رہا تھا۔

تو فریب کھا رہا ہے، سخت فریب، تو فریدہ کے انتخاب کی سادگی پر جا رہا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ دنیا کا بہترین، کامیاب ترین فریب وہی ہے جو بالکل سادہ ہو، کہاں تو کہاں فریدہ،

کیا فریدہ بھی کوئی وظیفہ ہے جو تجھے امتحان کے شاندار نتیجہ کے عوض ملا ہے ـــــــ فریدہ اچھی ہے، بہت اچھی ہے، بالکل چاند ہے، مگر چاند میں حسن، رعنائی، دل آویزی کے ساتھ دھبہ بھی تو ہے۔ ہلکا اور خفیف سا دھبہ، جو ساری دنیا میں نظر آتا ہے۔ سچ پوچھو تو چاند کی ساری دلکشی صرف محسوس ہوتی ہے۔ مگر جب اُس کی طرف دیکھو تو نظر اُس کے دھبہ پر ہی مرکوز ہوتی ہے ـــــــ ہر اچھی چیز میں کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے۔ چیز جتنی اچھی ہوگی۔ کوئی چیز ہو، جاندار، بے جان، قدرتی تخلیق، یا سائنس کی ایجاد۔ اس میں اتنا ہی شدید نقص ہوگا۔ خوبی خود نقص کی دلیل ہے، قدرت نے اس طور پر ہر شے میں توازن پیدا کر دیا ہے۔ اگر کسی چیز کا کوئی جز بہتر ہے، تو جوابی طور پر، اُس کا، کوئی نہ کوئی، دوسرا جز ضرور کچھ ناقص ہوگا ـــــــ اس طرح بھلائی اور برائی کی اوسط عام طور پر، کم و بیش، یکساں ہوگی ـــــــ بڑے دماغ میں بڑی خوبیاں ہوتی ہیں، مگر خوشامد پسندی کی کمزوری، اکثر و بیشتر، وہاں بھی ہوتی ہے ـــــــ اور صنفِ نازک میں یہ کمزوری قوی تر ہوتی ہے ـــــــ اس موقع پر ارشد کو اچانک کنوکیشن کا وہ دلچسپ منظر یاد آ گیا جب کچھ شریر لڑکے حسین اور شوخ لڑکیوں پر، اسٹیج سے ڈگری لے کر واپسی کے وقت، کاغذ کی گیند پھینک رہے تھے اور وہ مسکراتی، جسم سمیٹتی، سرنگوں، تیز تیز قدموں سے، اپنی جگہ پر واپس جا رہی تھیں ـــــــ

"یہ چیز اخلاق سے گری ہوئی ہے"، وائس چانسلر نے، فہمائش کے انداز میں، لڑکوں سے کہا ـــــــ "یعنی امتیازی سلوک میں دل آزاری ہوتی ہے، مساوات ہونی چاہیئے"، کسی منہ پھٹ لڑکے نے، کسی گوشہ سے، آواز بلند کی۔ ـــــــ اور ساری لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں، جیسے واقعی یہ بالکل اُن کے دل کی بات کہہ دی گئی تھی ـــــــ اُس کے بعد ہی فریدہ کا نام پکارا گیا،

اور اُس پہ یکبارگی کاغذی گیندوں کی خوب بارش ہوئی ــــ شاید یہ وائس چانسلر کی فہمائش کا ردِ عمل تھا، یا فریدہ کی امتیازی حیثیت کا اعتراف۔ مگر وہ بالکل جھجکی، جھینپی یا بھاگی نہیں ۔ وہیں، ایک خاص ادا سے سر جھکا کر رک گئی، یعنی جتنا برسنا ہے برس لو، تمہارے دل کا بھی ارمان نکل جائے ۔ اور ہمارے دل کا بھی ــــ جب گیندیں رُکیں، وقار و سنجیدگی سے، مسکرا کر "شکریہ" کہتی ہوئی اپنی جگہ پہ جا کر بیٹھ گئی ــــ لیکن اب آئندہ آنے والیوں پہ گیندیں برسنا رُک گئیں، شاید ختم ہو گئی تھیں ــــ اب اُس کی بہنوں کے حصہ میں صرف تالیاں رہ گئیں ــــ اُس وقت تو ارشد بھی اس تفریح سے بہت محظوظ ہوا، فریدہ پر گیند پھینکنے کا اُس کا دل بھی بہت چاہا، مگر افسوس کہ اُس نے پہلے سے اس کی تیاری نہیں کی تھی، اور وقت کے وقت کون اس کو اپنی گولی بارود میں سے حصہ دے دیتا، ایسے جوان مردوں سے اُس کا خلا ملا بھی تو نہ تھا، وہ تو کتابی کیڑا تھا، اور اپنے ہی جیسے کیڑے مکوڑوں سے وہاں ملتا تھا ــــ اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس کی اس ریاضت کے عوض، کالج سے نکلتے نکلتے، اس پر اللہ تعالےٰ کی رحمت کا بادل یوں اچانک پھٹ پڑے گا ۔ اور فریدہ جیسی حسینہ کی نظرِ انتخاب اس پر پڑ جائے گی ــــ اُس کے دماغ میں ایک عجیب ہیجان پیدا ہو گیا، اور وہ تفہیم و استدراک کی قوت بالکل کھو بیٹھا ــــ اس نے سوچا ہمارے کی ساری پونجی صرف ایک ڈگری ہے، اس کی قیمت، اس وقت، اس کاغذ کے برابر بھی نہیں ہے، بہت سے بہت کوئی چھوٹی سی کلرکی کہیں مل جائے گی، ابھی تو ابھی اپنی پڑھائی کا قرض بھرنا ہے ۔ اس حالت میں، اور اس زمانہ میں فریدہ کے معیار کی لڑکی سے شادی کرنا خواب کی بات تو ہو سکتی ہے، حقیقت کی نہیں ــــ اُسے اپنے شفیق اُستاد عالم صاحب کی گفتگو یاد آ گئی ۔

"سر، اب تو آپ وکالت کر رہے ہیں، سنا ہے بڑی اچھی چل رہی ہے، اب تو آپ نے شادی کر لی ہو گی!"

وہ ہنس پڑے "خوب میاں! ابھی تو موٹر بھی نہیں خریدی، شادی کا کیا سوال ہے، اتنی بڑی گٹھڑی کیا میں اپنے کندھوں پر لئے پھروں گا۔۔۔۔۔۔"

اور ارشد کو فریدہ واقعی ایک گٹھڑی معلوم ہونے لگی۔ حسن، شوخی، سلیقہ، اور علم کی نادر گٹھڑی ــــ مگر "پاک دامنی" کچھ مشتبہ معلوم ہوئی۔ اس کے عزیزوں اور دوستوں کی نگاہ میں زیادہ، خود اس کی نگاہ میں مقابلتاً کم ــــ اس سلسلہ میں اُس نے جتنی جستجو کی اس کے شبہ کو مزید تقویت ملتی گئی۔ اس کے رقیب اور بدخواہ عزیز بھی تو اپنا کام کر رہے تھے ــــ اس کے پراگندہ دماغ میں یہ بات خود آئی، یا دوسروں نے سمجھا دی کہ فریدہ کا بے طلب ارشد کو چننا اُس کی مجرمانہ زندگی کا کھلا ثبوت ہے، ورنہ اس سے بہتر متعدد امیدواروں کو نظر انداز کر کے اس کو منتخب کرنے میں کیا مصلحت ہے ــــ ظاہر ہے اوروں کو، اُن سے زیادہ قریب رہنے کی وجہ سے، اس کے سارے حالات معلوم ہیں۔ ان کی نگاہ میں وہ بیوی کا وقار نہیں حاصل کر سکے گی ــــ مرد، اپنی لغزشوں کو، طرۂ جواں مردی سمجھتا ہے، اور شادی کے بعد ڈھکے چھپے الفاظ میں، بیوی سے اس کا تذکرہ کرنے میں یک گونہ فخر محسوس کرتا ہے ــــ مگر عورت، ایسی صورت میں اپنی ذرا سی بھی کوتاہی پر، نہایت احتیاط سے، پردہ ڈالنا چاہتی ہے ــــ

ــــ ارشد کے خیال میں فریدہ نے بھی اس کو ایک پردہ کے ہی طور پر منتخب کیا تھا۔ شوہر نہیں، صرف پردہ، معمولی سا پردہ، حقیر سا، ہلکا سا پردہ، جسے وہ ایک انگلی کے اشارے سے ہٹا کر ہر وقت آجا سکے۔ روشنی کے لئے آڑ، گرد و غبار کے لئے آزادی، اس غرض کے لئے ایک غریب گریجویٹ سے زیادہ موزوں اور کون

ہو سکتا ہے ——— فریدہ کے لئے تو ٹھیک ہے، مگر میرے لئے تو وہ گویا ایک
پاپ کی گٹھڑی ہے، جو خود بھی ڈوبے گی، اور مجھے بھی لے ڈوبے گی، آج نہیں،
تو کل، یہ کاغذ کی ناؤ کئے دن چلے گی۔ ہوا کے رُخ کے ساتھ آج ادھر، کل اُدھر
پھر نہ جانے کدھر، وہ اپنے ساتھ میری زندگی کی ساری رعنائیاں بھی بہالے جائے گی
——— اب ارشد کو اپنی زندگی کی ساری مصیبتیں یاد آنے لگیں، کیسی پریشانی میں
اس کا بچپن گذرا، کتنی مصیبتوں سے اُس نے تعلیم حاصل کی، اب تک اس کی زندگی
میں خوشی کی ایک رمق نظر نہ آئی، آج کس قدر جدوجہد کے بعد یہ ڈگری اُس کے
ہاتھ میں، ماکلید خوشی بن کر آئی ہے، تو اُسے بھی یہ فریدہ ایک حسین فریب سے
چھیننا چاہتی ہے ——— وہ اس خیال سے ایک دم سہم گیا لرز گیا، چیخ اُٹھا۔
——— نہیں نہیں، میں اس پُر فریب حسینہ کے لئے نہیں ہوں ——— مجھے حور نہیں،
مجھے ایک لڑکی چاہیئے، عصمت مآب، پاک دامن ——— اور اس نے یکبارگی فریدہ
سے شادی سے انکار کر دیا ———

ارشد کے انتخاب کے اعلان پر ہی گیا کچھ کم ہنگامہ ہوا تھا کہ اب اُس کے
انکار نے جلتی پر تیل کا سا اثر کیا ——— فریدہ کی بساط زندگی اچانک اُلٹ گئی،
اس کی اُمیدوں کے سہانے خواب بالکل منتشر ہو گئے۔ اس کے دل کی دنیا اُجڑ گئی،
اور اُس کی خودداری، جس کی وہ اب تک بڑے حوصلہ سے حفاظت کرتی آئی تھی،
بُری طرح مجروح ہوئی، بے حد، بے انتہا ——— یوں تو اس کے خواہش مند
بہت تھے، مگر اولاً تو اس کی اپنی نگاہ میں، ان سب کے دامن، ان ساری خوبیوں
سے، جو وہ ارشد میں دیکھ رہی تھی، اور جس کی وہ متلاشی تھی، خالی نظر آئے ———
واقعی، یا شاید ان سب کی قربت کی وجہ سے، اُن کے محاسن، فریدہ کی نگاہ میں ماند
پڑ گئے تھے، اور ان کے طلب کی سبقت نے، ان کی کمزوریوں کو اُس کی نگاہ میں

اُجاگر کر دیا تھا ـــــ یا عورت کی کچھ فطرت ہی ایسی ہے۔ کہ جو مرد اس کے پیچھے بھاگے وہ اُس کے آگے بھاگتی ہے، اور جو اُس کے آگے بھاگے وہ اُس کے پیچھے بھاگتی ہے ـــــ جو بھی ہو، مگر جن کو وہ ایک بار جواب دے چکی تھی، ان میں سے، کسی کی طرف اب وہ دوبارہ رجوع کرنے میں اپنی بڑی سُبکی محسوس کر رہی تھی ـــــ اُس حلقہ سے باہر وہ اپنا ساتھی تلاش کرنے لگی، لیکن اب تو وہ اپنی زندگی کے میچ میں ٹاس ہار گئی تھی، اس کی ہر جستجو ناکام ہوتی رہی، وہی سلوک جو اُس نے اپنے سائیکوں سے کیا تھا۔ اب اُس کے ساتھ ہونے لگا ـــــ خدا کی بے مانگی عنایتوں کی قدر نہیں ہوتی، پھر انسان کی پیش کش کی کیوں ہو۔ ہر ناکامی پر اُس کی شہرت مزید داغدار ہوتی گئی ـــــ اچھی اور بری شہرت میں بڑا فرق ہے۔ اچھی شہرت عطر کی خوشبو ہے، جو کمرہ ہی میں محدود رہتی ہے، بُری شہرت گندے نالے کی بدبو ہے، جو سارے محلے کا دماغ پھاڑ دیتی ہے ـــــ اب اس کی خوبیوں کے چرچے ماند پڑ گئے۔ اور اس کی برائیاں، افسانوی برائیاں، ایک سے ایک دل کش انداز میں، ہر مجلس میں اچھل رہی تھیں، اُچھالنے والوں کی تعداد، روز بروز بڑھ رہی تھی ـــــ جیسے پانی میں ایک پتھر پھینک دیا، ایک بھنور بنا، ابھی وہ ٹوٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرا، تیسرا، چوتھا، پھر بننے لگا۔ اور بھنور مسلسل، وسیع سے وسیع تر بنتے چلے گئے، لوگوں کی تفریح ہوتی رہی، اور دیکھتے دیکھتے، پورے تالاب میں ایک ہل چل مچ گئی ہے ـــــ رازدار دوست، برے وقت میں، سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے، فریدہ کو بھی اس کٹھن گھڑی میں، اس صورت کا سامنا کرنا پڑا، آج اس کے سارے دوست اُس سے برگشتہ تھے، کسی کی کوئی وجہ تھی، کسی کی کوئی، مگر کوئی نہ کوئی، وجہ شکایت، ہر ایک کے پاس تھی۔ وہ کتنوں کو رام کرتی، کتنوں کو خوش کرتی، کتنوں کو خاموش کرتی، ـــــ حالات بڑی تیزی سے بگڑتے رہے، وہ تنہا بڑی ہمت سے

اس کا مقابلہ کر رہی تھی، اپنی منزل اُس کی نگاہ میں تھی، وہ جلد سے جلد اُس کے قریب پہنچ جانا چاہتی تھی، مگر وہ سراب کی طرح اس سے دور بھاگ رہی تھی وہ افتاں وخیزاں، ابھی اس دشوار گزار راستہ پہ بھٹک ہی رہی تھی کہ ارشد، راہ گم کردہ کو اپنی ایک راہ مل گئی، اس کی منتخب راہ ــــ اور اس کا گھر، اس کی مرضی کے مطابق، بس گیا ــــــ فریدہ کی اُمید ارشد سے تو کبھی کی ٹوٹ چکی تھی ـ اس کے خیال میں، اب اُس کے ذہن میں، ارشد کا کوئی خیال باقی نہیں تھا، پھر بھی شاید تحت الشعور میں کوئی دھندلی سی امید موجود تھی، جس کے ٹوٹتے ہی وہ بالکل دل شکستہ ہو گئی، اور یکبارگی اس کی جدوجہد ڈھیلی پڑ گئی ــــــ اس کی بدنامی جنگل کی آگ کی طرح، برابر پھیلتی جا رہی تھی، وہ ہر ایک سے اب دل برداشتہ ہو چکی تھی ـ اپنے آپ سے ماحول سے، سماج سے ــــ پھر بھی وہ شاید، کچھ دیر اور مقابلہ کرتی، مگر حالات اور اتفاقات نے اسے مزید اس کا موقع نہیں دیا ــــ اس نے اب جس کو بھی اپنانا چاہا، اُس نے اُس کے ساتھ دغا کی، کوئی اس کا نہیں ہو سکا، مجبوراً وہ سب کی ہو گئی، اور تھوڑے دنوں میں وہ کسی کی بھی نہیں رہی، شاید سماج کی بھی نہیں ــــ اب وہ اپنی مکمل بربادی ہی میں اپنی زندگی تلاش کر رہی تھی ــــ

یہ اس کی زندگی کا دوسرا دور تھا، داخلی اور خارجی قیود سے بالکل آزاد، اب اس کو سب کچھ حاصل تھا، وہ اب آرام سے تھی، بالکل آرام سے، کوئی گھٹن، کوئی اُلجھن، کوئی خوف، اب اس کو نہیں تھا، نہ چور کا ڈر، نہ اچکوں کا خوف، اُس کی اب ساری پونجی کھلی پڑی تھی، اب وہ سرِ راہ سونا اُچھالتی چلتی تھی، اب وہ اپنی ہی نہیں، اپنے ماحول کی بھی مالک تھی ـ اب وہ کسی کی منت پذیر نہیں تھی، لوگ اُس کے منت پذیر تھے ــــ اس کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی تھی، اس کی نگاہ میں دنیا ہی بدل گئی تھی، وہ متحیر تھی، کیا دنیا کا اصل رنگ یہی ہے؟ کیا وہ اب تک خواب میں تھی؟

یا اب خواب میں ہے؟ ۔ جو بھی ہو، مگر اب تو وہ بیدار ہو گئی تھی، کبھی وہ اپنی زندگی کے ناؤ کے لئے ایک کھویا ڈھونڈ رہی تھی، آج خود طوفان زندگی، اپنی پوری دل فریبیوں کے ساتھ، اُس کے قدم چوم رہا تھا ۔۔۔۔ وہ اپنی وارفتگی پر جھوم رہی تھی، اس کے دل و دماغ سے، ساری کوفت، ساری فکر، ساری پریشانیاں یکسر محو ہو گئی تھیں ۔۔۔۔ دنیا کی نگاہ میں اس کی عزت ہے، یا نہیں، اب اُس کو اس کا خیال بھی نہیں تھا، اس نے اب سمجھ لیا کہ دنیا کی عزت کا معیار وقت و حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، وہ جس کی عزت کرتی ہے، اس کو پیار نہیں کرتی، جس کو پیار کرتی ہے، اس کو زبان سے ناچیز کہتی ہے، اور دل میں اُس کو پوجتی ہے، فریب دہوکہ، دغا ۔۔۔ فرد ہو، یا قوم، سب کا یہی حال ہے، جو اس کو جتنی خوبی سے کرتا ہے، وہ دنیا میں اتنا ہی فروغ پاتا ہے، اور جس کو فروغ ہے، اس کو عزت، دولت، پیار، سب کچھ حاصل ہے، اپنوں کا بھی، اور غیروں کا بھی ۔۔۔ یہاں یہ سب چیزیں بکتی ہیں، اور صرف صاحب مقدوری کو ملتی ہیں ۔۔ اور پھر عزت تو اضافی چیز ہے، بالکل اضافی، اس کا وجود ہر طبقہ میں ہے، صرف اپنے ماحول میں فوقیت، اس سے زائد کچھ نہیں ۔۔ اب فریدہ، اپنی نئی زندگی میں، کامیابی حاصل کرنے لگی ۔ کامیابی سکون کی محتاج ہے، اور اب اُس کی زندگی بالکل پُرسکون تھی، کسی کی طلب نہیں، کسی کے آنے کی خوشی، نہ جانے کا غم، کوئی اُس کا نہیں تھا، نہ وہ کسی کی تھی، پھر بھی سب اُس کے تھے، اور وہ سب کی تھی، وہ سب سے خوش تھی، اور سب اس سے خوش، وہ اپنا غم نہ کسی کو دیتی، نہ خود کسی کا غم کھاتی، لوگ اس کو اپنی خوشی کا شریک بناتے، اور وہ لوگوں کو اپنی خوشی کا شریک ۔۔ اور شریک غم، اس کا تو اسے اب کوئی خیال ہی نہیں رہ گیا تھا ۔ کبھی وقت تھا جب وہ کہتی تھی ؎

"تنکا تو ہو کوئی کہ سہارا کہیں جسے"

مگر اب تو وہ نئے راستہ پر چل پڑی تھی، —— پرانے راستے سے بالکل مختلف، یہاں مسافر نواز بہتیرے تھے، ان کی دل داری میں وہ گویا اپنی پچھلی زندگی کی ناکامیاں بھول گئی، اور اب اس کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ ؎

موجودہ زمانے میں وفا ہے بھی، نہیں بھی،

مگر دفعتاً ارشد پھر اس کی راہ میں آ گیا — شاید زمین کی طرح، زندگی بھی اپنے محور پر گھومتی ہے۔ اب ارشد، وہ ارشد نہیں تھا، وہ تو اب ایک گزٹیڈ افسر تھا، اور فریدہ ایک سوسائٹی گرل، ارشد سے سینکڑوں ڈرتے تھے، اور فریدہ پر سینکڑوں مرتے تھے —— اس کو نہ ڈرنے والوں کا خیال، نہ اُس کو مرنے والوں کی فکر، دونوں کے دل، دماغ، حالات کی تبدیلی کے ساتھ، یکسر بدل گئے تھے —— ارشد اب پاک دامنی سے سیر ہو چکا تھا —— دنیا کی تمام چیزوں میں، حالات میں، خیالات میں، ساری خوبصورتی، دل آویزی، دل فریبی، دل کشی، صرف بعد میں ہے، تخیل میں ہے، تصور میں ہے، قرب میں حقیقت ہے، اور حقیقت میں سیری، مایوسی، اور آخر میں تلخی —— وہ مایوسی کے آٹھ سال، خوش، ناخوش، بیوی کے ساتھ — پابندئ رہائش کے تحت، کاٹ چکا تھا، اور شاید دس، پندرہ سال اور وہ اسی طرح کاٹ دیتا، اور پھر کچھ اپنے حالات سے مانوس، اور زیادہ مجبور ہو کر، تبدیلی کی حس کھو دیتا۔ مگر وہ اچانک اینٹی کرپشن کی ایک بڑی تحقیقات پر مامور ہو گیا، پولیس اور سول سپلائز کے بڑے افسران اُس میں ماخوذ تھے —— وہ خود بھی پولیس کا ایک افسر تھا، مگر وہ مقابلے کے امتحان سے آیا تھا، پولیس کے نچلے طبقہ کی گندی فضا سے بالکل متاثر نہیں ہوا تھا، اس کی ملازمت کا ریکارڈ، جوڈیشل افسروں کی طرح بہت صاف تھا، کوئی سفارش، کوئی الاپچ، کوئی خوف، اس کو اپنے کار منصبی

کی انجام دہی اسے روک نہیں سکتا تھا، محکمہ کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ مگر ان تحقیقات اور اس تحقیقات میں بڑا فرق تھا، یہاں لوہے سے لوہے کو کاٹنے کا سوال تھا، آج وہ ان لوگوں کی تحقیقات کر رہا تھا جنہوں نے اپنی ساری مدت ملازمت تحقیقات کرنے ہی میں بسر کی تھی، ایک سے ایک پیچیدہ گتھی سلجھا چکے تھے، اور حسب ضرورت الجھا بھی چکے تھے۔ اس وقت تو وہ خود ڈوب رہے تھے، اُن کی ساری قوت مدافعت ایک دم اوپر آ گئی تھی، جو ہنر ان کو اپنے کار منصبی کی انجام دہی کے لئے سکھایا گیا تھا، آج وہ اسے اپنی گلو خلاصی کے لئے انتہائی ہوشیاری سے، استعمال کر رہے تھے۔ ارشد نے جوں ہی ان کی تحقیقات شروع کی، ان لوگوں نے خود ان کی تحقیقات شروع کر دی۔ زندگی کی ابتدا کیسی رہی؟ معاشی حالات شروع میں کیسے تھے؟ کہاں کہاں تعلیم پائی؟ کس کس سے دوستی رہی؟ کس کس سے مخالفت؟ کیا کیا شوق رہے؟ زندگی میں کوئی ناکامی؟ کوئی کمی؟ — ازدواجی زندگی کیسی ہے، مطمئن؟ یا غیر مطمئن؟ — پولیس کا دماغ تھا، سول سپلائز کا روپیہ۔ کوئی تدبیر مشکل نہیں تھی، صرف صورت دریافت ہونے کی دیر تھی — اُنہوں نے اپنی وکالت کے لئے فریدہ کو تلاش کر ہی لیا، اور اس خوبی اور خوبصورتی سے فریدہ کو ارشد سے ملانے کا انتظام کیا کہ ارشد کو کیا، خود فریدہ کو بھی، اگر اس بندوبست کا علم پہلے سے نہ ہوتا، تو وہ کبھی اس فریب کو نہ سمجھ پاتی — ایک ریل کے سفر میں، بالکل اتفاقی طور پر دونوں کی ملاقات، اتنے عرصے کے بعد ہو گئی، بلکہ کرا دی گئی — اور فریدہ نے نہایت خوبی سے اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی، اس کی جھنجھناہٹ نے ارشد کا سارا ذہنی نظام بالکل درہم برہم کر دیا — اب وہ اپنی جگہ پر ارشد کی خواہش مند نہیں تھی، قطعی نہیں، البتہ ارشد کی خواہش پر، اور وہ اپنی، یعنی اپنے مؤکل کی، غرض سے، اس سے برابر ملتی رہی — ارشد اپنی تحقیقات کرتا رہا اور فریدہ اپنے طور پر اپنا کام۔ اب فریدہ

بھی اپنے پیشہ کی، اتنی ہی ماہر تھی، جتنا ارشد اپنے پیشہ کا —— اس نے اب وہ خود اعتمادی حاصل کرلی تھی —— جو دوسرے دل کا سہارا لوٹ جانے کے بعد ہی انسان میں پیدا ہوتی ہے، اور اسے اپنی قدر بتاتی ہے —— اب وہ ارشد کے پاس، اپنا نہیں، صرف اُس کا دل بہلانے، اور اپنا، یا اپنے موکل کا، کام نکلوانے آتی تھی۔ اور وہ اس کام کو پوری مستعدی اور ایمانداری سے کر رہی تھی —— اس کی جانب سے اب ارشد کے لئے خود سپردگی کا کوئی جذبہ یا کسی طرح کی کوئی تحریک نہیں تھی —— مگر اس کا کیا جواب کہ، کبھی خلوص کو ٹھکرانے والا آج فریب پر فدا ہوا جا رہا تھا، بے حد، بے تحاشا —— ارشد نے اس کے دل میں اپنی پرانی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی، مگر اب وہ فریدہ، فریدہ کہاں تھی، اس کی تو اب پیشہ ور جیسی بالکل ایک نئی زندگی تھی، نئی قدریں، نئی آرزوئیں، نئے آداب، اور زندگی کے نئے تقاضے تھے۔ لطف و اکرام نہیں، اور فقط جو رہ گئیں۔ اب وہ جبر اور جور کی دنیا سے بہت دور جا چکی تھی —— زندگی میں ٹھہراؤ کہاں، وہ تو مسلسل بہاؤ ہے، ہمیشہ آگے، پیچھے نہیں، اس کا سبق دہرایا نہیں جاتا، ہمیشہ نیا پڑھا جاتا ہے —— کبھی ارشد نے، ہاں! اسی ارشد نے، فریدہ کی پاک دامنی پر شبہ کر کے، اس کا نخود بڑھا ہوا ہاتھ، تھامنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب آج جب وہ اس شبہ کی مکمل تصویر تھی، تو وہی ارشد اس پر ایسا فریفتہ ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی فنکارانہ تخلیق کا بہترین نمونہ ہو، اور اب شاید وہ تھی بھی وہی!

ارشد کی گرویدگی بڑھتی رہی، اور فریدہ، اپنے موکل کی مطلب براری کے لئے، اپنا پارٹ خوبی سے ادا کرتی رہی۔ اس کے لئے اب ارشد میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہ گئی تھی، جیسے اب ارشد کے لئے اپنی روایتی بیوی میں —— کبھی فریدہ کو ایک روایتی شوہر کی ضرورت تھی وہ اب اس سے اوب چکا تھا، وہ اب دنیا کو نئے زاویہ سے دیکھ رہا تھا، پرانے خیالات، پرانے حالات کے ساتھ بدل گئے تھے۔ پرانے کپڑوں کی طرح، اُس کو اب اپنی بیوی بدوضع معلوم ہو رہی تھی، بیوی میں زمانہ کے ساتھ بدلنے کی

صلاحیت نہیں تھی، اور ارشد میں اب زمانہ کے بہاؤ سے ہٹ کر کھڑے ہونے کا تحمل نہیں، اب وہ، نئی روایات کا دلدادہ تھا، ان سے بھی زیادہ جو ابتدا سے جدید روایات کے ماحول میں پلے تھے۔ دل کے نئے تقاضوں نے، پرانے تقاضوں پر فتح پالی تھی، اس کا ماضی اس کو چھوڑ گیا تھا، یا وہ خود اپنے ماضی کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، صرف بیوی ہی ماضی کی ایک تلخ یادگار باقی رہ گئی تھی، جو اس کی سوشل زندگی کو، افسرانہ زندگی سے، ہم آہنگ نہیں ہونے دے رہی تھی ــــ اور فریدہ، یہ تو اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے، گویا اب دونوں، وہ بالکل مختلف راستوں پر بھٹک کر، ایک سیدھی راہ پر آگئے تھے، دنیا کی سیدھی راہ!

ارشد اب اس کا بری طرح جویاں تھا، مگر یہ چیز تنہا اس کے فیصلہ کی تو نہیں تھی، آج تو وہ سائل تھا، اور کس کے در پر، جسے کبھی اس نے خود بری طرح اپنے دروازے سے واپس کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اب تو فریدہ سے معاملات اسی کی شرط پر طے ہو سکتے تھے۔ کیوں نہ ہوتے، وہ تو اب ایک بڑی عزت کی مالک تھی، وہی عزت جو اب ارشد کی نگاہ میں اپنی قدر بدل چکی تھی ــــ ایک پاک دامن عورت کی روایتی عظمت ہوتی ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، مگر ایک سوسائٹی گرل کی تو ایک قیمت ہوتی ہے، اور اسی کے لحاظ سے اس کی قدر ــــ وہی فریدہ جو اس کو کبھی بلا قیمت مل رہی تھی، آج بڑی سے بڑی قیمت پر بھی اس کو حاصل ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ حاصل تو ہو سکتی تھی، حاصل تو ہو بھی گئی تھی، مگر اب تو ارشد اس کو خریدنا چاہتا تھا ــــ اور اب اونچی بولی ہی قیمت پر بک سکتی تھی۔ اب تو وہ ایک ایسا مال تھا، جو شوکیس میں خریداروں کو صرف دکھانے، لبھانے، رجھانے کے لئے رکھا جاتا ہے، فروخت کرنے کے لئے نہیں ــــ اگر کوئی خریدار اسے خریدنے کے لئے اڑ ہی گیا تو دوکاندار بے سر پیر کی قیمت ہانکتا ہے، تاکہ خریدار خود ہی بھاگ جائے مگر اب ارشد کہاں بھاگ سکتا تھا، وہ تو اسے اب ہر قیمت پر

خریدنے کے لئے تلا ہوا تھا۔

فریدہ، اس زمانہ کی، بہت سی باتیں بھول چکی تھی، مگر یہ کیسے بھولتی کہ ایک پاک دامن بیوی کے لئے خود اس کی محبت کی پیشکش، کبھی اس بے دردی سے ٹھکرائی گئی تھی — پاک دامنی! — وہ تو اس خیال سے ہی بھڑکنے لگتی تھی، ارشد کے اسی خیال نے تو کبھی اس کی زندگی سے انتقام لیا تھا۔ وہ پھر آج اس پاک دامن سے پورا پورا انتقام کیوں نہ لیتی۔ اس نے ارشد کے اصرار پر اس کی بیوی سے طلاق کی شرط لگادی — اور ارشد نے، ہاں، اسی ارشد نے، بلا تامل، فوراً اپنی بیوی کو طلاق دے دی — تین معصوم بچیوں کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو بھی اس کو اپنے ارادہ سے باز نہیں رکھ سکے۔

"کیا اب فریدہ کی پاک دامنی سے تیرا اناشبہ دور ہو گیا؟" بیوی نے چلتے وقت ارشد سے صرف یہ مختصر سا سوال پوچھا۔

"ماضی کے شبہ، اور مستقبل کے احتمال پر، حال نہیں برباد کیا جا سکتا" ارشد نے اپنے فیصلہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"شادی ایک معاہدہ ہے، جس کا تعلق صرف آئندہ زندگی سے ہے، گذشتہ سے نہیں......"

رانی

رمضانی کا اصل نام کیا تھا، یہ کسی کو نہیں معلوم، خود اس کو بھی نہیں، بس لوگ اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ کسی نچلے طبقے کی، آٹھ سال کی، یتیم بچی تھی، جس کو فاروق وکیل کا کوئی موکل، اس کے نوزائیدہ بچے کو کھلانے کے لئے، تحفہ کے طور پر پیش کر گیا تھا، نام کا علم شاید اس کو بھی نہیں تھا ـــــ فاروق کی بیوی نے کھلائی کا ایک معروف نام "رمضانی" رکھ دیا، اور پھر وہ مستقل طور پر رمضانی ہو گئی ـــــ دو چار سال تک تو وہ صرف بچہ کھلاتی رہی، پھر وہ گھر کا اور چھوٹا چھوٹا کام، مثلاً جھاڑو دینا، جھوٹے برتن دھونا، انجام دینے لگی، چودہ پندرہ سال کی ہوئی تو باورچی خانہ اس کے سپرد کر دیا گیا، اس دوران میں، فاروق کی بیوی کا بھائی زاہد اس کو دیکھ دیکھ کر، اپنے دل میں بڑی بے کلی محسوس کرنے لگا۔ کچھ تو وہ لڑکپن ہی سے عاشق مزاج واقع ہوا تھا، اس پر رمضانی کے حسن جہاں سوز نے جلتے پر تیل کا کام کیا، وہ اس کی تپش سے بدحواس ہو گیا، رمضانی تو وہی تھی جو چھ سال پہلے آئی تھی، مگر اب اس پر شباب کچھ اس طرح ٹوٹ کر آیا، جیسے سورج گہن سے نکل آیا ہو ـــــ فاروق کی بیوی نے، اس کے حسن کو، پھٹے پرانے کپڑوں میں ڈھانکنے کی پوری کوشش کی، اس کی نقل و حرکت کو زیادہ تر باورچی خانہ ہی میں محدود رکھا ـــــ چاند کی ہلکی روشنی تو بادل کے ٹکڑوں میں کچھ دیر چھپ سکتی ہے، مگر سورج کی

تیز روشنی کو، وہ بھی نصف النہار کے وقت، بادل کے ٹکڑے کہاں تک چھپائیں گے ــــ لیکن زاہد کی بڑی رکاوٹ فاروق کی سخت پابندیاں تھیں، وہ اپنی بچیوں کی تربیت کے خیال سے، اپنے گھر کے ماحول کو بہت صاف ستھرا رکھنا چاہتا تھا، وہاں زاہد کو رمضانی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع نہیں تھا، وہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی جو وہ خط ہی کے ذریعہ اپنے دل کا حال اس سے کہتا، اور اس کا دل اسے چین نہیں لینے دیتا تھا، مجبوراً اُس نے فاروق کے مکان کا طواف کرنا شروع کر دیا کہ شاید کسی وقت رمضانی سے دروازے کے باہر ملاقات ہو جائے، مگر کم بخت رمضانی کے پاس صرف حسن ہی حسن تھا، عشق و محبت کی گھات سمجھنے کا شعور ابھی اس میں پیدا نہیں ہوا تھا ــــ اور یہاں زاہد کی بے تابی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی، اور اسی کے ساتھ فاروق کی بیوی کی پریشانی بھی، اس کو خوف تھا کہ فاروق کو اگر ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ زاہد اس کے مکان میں رمضانی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے، تو وہ اسی وقت زاہد کا یہاں آنا جانا بالکل بند کر دے گا، اور ممکن ہے وہ اس سلسلہ میں کچھ اور سخت قدم بھی اُٹھائے۔ اس نے زاہد کو بہت سمجھایا، مگر اس کی دیوانگی میں کوئی کمی نہیں ہوئی ــــ اسی درمیان میں اس کی ماں بیمار پڑ گئی، فاروق کی بیوی ان کو دیکھنے گئی تو رمضانی کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئی، اور واپسی میں۔ اس کو اپنے گھر کے لئے ایک بلا سمجھ کر، ماں کی خدمت کے لئے، وہیں چھوڑ آئی ــــ زاہد کی مراد بر آئی، اس کو اپنی ماں کی علالت خدا کی رحمت معلوم ہوئی، اب اس نے رمضانی سے اپنے دل کا حال، آنکھ یا زبان کے بجائے ہاتھ اور منہ سے کہنا شروع کر دیا وہ غریب جاہل۔ نو عمر، نا سمجھ، الہڑ ورڑکی تھی، جلد ہی سارے مراحل طے ہو گئے ــــ زاہد کا باپ تو برسوں پہلے مر چکا تھا، بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہو گئی تھیں ــــ ماں بستر علالت پر پڑی تھی میدان صاف ملا۔ خوب داد عیش دی ــــ ماں کی طبیعت جب سنبھلی اور اس کے علم میں یہ چیز آئی تو اس نے اپنا

سر پیٹ لیا، اور رمضانی کو کھڑے کھڑے اپنے مکان سے نکال دیا ــــ اب زاہد کو دن میں تارے نظر آنے لگے، جیب خالی، عشق ٹیں ٹیں ــــ ابھی تو بی، اے پاس کر کے اس نے رمضانی سے حرف عشق کا کاروبار شروع کیا تھا، جو پھوکٹ میں چل رہا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اسے کہاں لے جائے، وہ جہاں اُسے لے جاتا وہی اُسے اپنا لیتا ــــ وہ تو اب تک کبھی کی نیلام ہو کر، کسی کوٹھے کی زینت بن بھی چکی ہوتی، وہ تو بھلا ہو فاروق وکیل سرکار کی دھونس کا، جو اب تک اس حور شمائل کی جھلک بھی کوئی گاہک دیکھ نہیں سکا تھا، اور نہ کسی کو اس پہ کمند پھینکنے کا موقع ملا تھا ــــ زاہد نے آخرش اپنے ہی ایک بوسیدہ مکان میں، جہاں دن میں الّو بولتے تھے، ایک تنگ وتاریک کوٹھری رمضانی کی پناہ گاہ کے لئے تجویز کی اور وہاں اسے کڑک مرغی کی طرح بند کر دیا، وہ غریب آٹھ مہینہ تک وہاں پناہ گزین رہی ــــ زاہد کو جب موقع ملتا وہاں جا کر اس کو دانا پانی کچھ دے آتا، اور اپنی پیاس بجھا آتا ــــ بارے اس کے مرحوم باپ کے ایک دوست سینٹرل اکسائز کے کلکٹر ہو کر آ گئے، انہوں نے زاہد کو اپنے محکمہ میں انسپکٹر بنا کر اسی ضلع کی ایک تحصیل میں تعینات کر دیا ــــ بیروزگاری دور ہوئی، اور مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ ہو گیا ــــ مگر رمضانی کو رکھنے کا سوال اب بھی اس کے لئے سانپ کے منہ میں چھچھوندر بنا رہا ــــ اس کا مرحوم باپ ضلع کا ایک نامور وکیل ہونے کے علاوہ، شہر کی میونسپلٹی کا بارہ برس تک، نہایت خوش نام چیئرمین رہ چکا تھا، پورے ضلع میں اس کی بڑی شہرت تھی، اب اسی حساب سے صاحبزادے کی بدنامی بھی پھیلنے لگی، زاہد کو اپنی اور اپنے خاندان کی بدنامی سے زیادہ، اپنی نئی نئی ملازمت کا خطرہ لاحق ہوا اس نے رمضانی کو شہر سے ہٹا کر اپنے سرکل ہی میں ایک جگہ لے جا کر رکھنے کا پروگرام بنایا، مگر مشکل یہ

تھی کہ رمضانی صرف مجسم حسن تھی، اس کے علاوہ فقط رمضانی ——— زاہد نے اسے کوٹھری سے نکال کر اسٹیشن کا راستہ اچھی طرح سمجھایا، وہاں تک تو وہ خیر پہنچ گئی، زاہد نے اسے مزید یہ بتایا تھا کہ جب ٹرین آئے تو وہ زنانے ڈبے میں بیٹھ جائے، اور وہ خود آگے کسی ڈبہ میں بیٹھ جائے گا، جہاں اسے اترنا ہے وہاں وہ زنانے ڈبے پر آ کر اسے اتار لے گا، راستے میں اگر اس سے ٹکٹ مانگا جائے تو کہہ دے کہ ٹکٹ مردانے میں ہے ——— مگر جب ٹرین آئی تو یہ ساری ترکیبیں دھری کی دھری رہ گئیں ——— زاہد دور سے، رمضانی کو ہاتھ سے اشارہ کر کے ایک ڈبہ میں بیٹھ گیا، مگر رمضانی وہاں کی بھیڑ میں زاہد کو ٹرین میں سوار ہوتے نہیں دیکھ سکی، وہ چپ چاپ منہ ڈھانپے گٹھری بنی مسافر خانے کے ایک کونے میں بدستور بیٹھی رہی ——— ٹرین جا چکی تھی، پلیٹ فارم مسافروں سے خالی ہو گیا، تو ریلوے پولیس کے ایک کانسٹبل کی نظر اس تنہا عورت پر پڑی، اس نے اس سے پوچھا "تو کون ہے، یہاں کس کے انتظار میں بیٹھی ہے؟" ——— ایک سادھو بولا "یہ ایک ہندو کنیا ہے، کوئی ملا اس کو بھگا کر لے جا رہا تھا، گاڑی میں بیٹھتے وقت اس نے ہاتھ ہلا کر اس کو اشارہ کیا، میں اس کا مطلب سمجھ گیا، اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، گاڑی نکل گئی" ———

ہندو مسلم فسادات کے شعلے بجھ گئے تھے، مگر ابھی چنگاری باقی تھی۔ یہ خبر چشم زدن میں جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی ——— ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج والے فوراً دوڑ پڑے، اور رمضانی کو اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کرنے لگے، ابھی پولیس کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ جمعیت العلماء اسلام والے بھی آ دھمکے ——— چلئے ہندو مسلم فساد کے لئے خاصا آتش گیر مادہ اکٹھا ہو گیا ———

ڈپٹی کمشنر کو اطلاع ملی، وہ اسی وقت کپتان پولیس کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچا، اور سارے شہر میں مسلح پولیس تعینات کر دی ——— رمضانی کو توالی لائی گئی،

اس غریب کی ساری زندگی کا تجربہ تو باورچی خانے اور اندھیری کوٹھری تک ہی محدود تھا۔ وہ اتنے سارے افسران سے کیا سوال جواب کرتی، بالکل خاموش، اپنی بے بسی پر روتی رہی، بار بار پوچھنے پر بڑی دقت سے "جاہد" کا نام دینے بنایا۔ پولیس اسی وقت زاہد کے مکان پر گئی، اس کی ماں نے کہا "زاہد تو آج اپنی ملازمت پر گیا، اس سلسلہ میں جو گفتگو کرنی ہو اس کے دونوں بہنوئی فاروق اور حامد سے کرلو" ——— اب یہ دونوں بلائے گئے، ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا کہ جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ یہ لڑکی ہندو ہے، یا مسلمان، حامد اس کو اپنی حفاظت میں رکھے —۔ حامد سمندر پار آئی، این، اے (I.N.A.) کی فوج میں شامل ہو گیا تھا، ہندوستان واپس آنے پر وہ "نیتاجی" کہلانے لگا، اور کانگریس گورنمنٹ نے اعتراف خدمت کے طور پر اس کو اسی ضلع میں فیلڈ افسر مقرر کر دیا ——— جلد ہی وہ گورنمنٹ کے معتمد ترین افسران میں شمار ہونے لگا ——— تو "نیتاجی" رمضانی کو اپنے گھر لے آئے ——— اسی زمانہ میں اتفاق سے "نیتاجی" کی بڑی بہن اور بہنوئی ان سے ملنے کے لئے پاکستان سے آئے ہوئے تھے، اور اسی موقع پر حامد کی دوسری بہن بھی ضلع غیر سے، اپنے شوہر کے ساتھ اپنی بڑی بہن سے ملنے ملانے "نیتاجی" کے یہاں آگئی ——— رمضانی اور زاہد کے رومانس کی پوری داستان حامد کی بیوی کو معلوم تھی، اور ساتھ ہی اپنے "نیتاجی" کی عیش پرستیوں کے حالات سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی ——— "نیتاجی" نے وہاں اپنے مقامی با اثر ہم مشرب نیتاؤں کی شرکت میں ایک "نیتاجی بھوج بھنڈار" کھول رکھا تھا۔ یہ بھنڈار ہوٹل کی شکل میں، دراصل ان نیتاؤں کے لئے نائٹ کلب تھا، جہاں خوب روشن نار تھی لڑکیوں کی خوب تواضع ہوتی تھی ——— مگر اب تو حامد کے لئے گھر ہی میں بہترین مال پہنچ گیا تھا، اور اس میں دوسرے نیتاؤں کو

حصہ دینے کا بھی سوال نہیں تھا ـــــ ڈپٹی کمشنر کو "نیتاجی" نے یقین دلا دیا کہ رمضانی واقعی مسلمان ہے ـــــ اور اب اطمینان سے اس کو ہر رات اپنی خوابگاہ میں، اپنے سر اور بدن کی مالش کے لئے بلانا شروع کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے دوسرے بہنوئی نے بھی وقتاً فوقتاً رمضانی کے ساتھ خرمستیاں کرنی شروع کر دیں۔ تنویر اودھ کا ایک خوش باش بے فکر رئیس زادہ تھا، بازار حسن کا بڑا رسیا تھا، اور اس کی خوب سیر بھی کی تھی، مگر اس گل نادیدہ کی بات ہی کچھ اور تھی ـــــ اب ایک بے چارے بڑے بہنوئی قوی ہی رمضانی کے در پر سجدۂ نیاز ادا کرنے سے رہ گئے تھے۔ وہ ایسے کچھ بڑے بھی نہیں تھے، چالیس کے قریب ہوں گے، مگر ان کی شادی کے وقت "نیتاجی" صرف پانچ برس کے تھے، اس لئے وہ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے ـــــ پھر قوی ایک پرانے خیال کا مدرس تھا، طلباء کو عورت کے تقدس کی صرف تعلیم ہی نہیں دیتا تھا، بلکہ خود بھی دل سے اس کا پوری طرح قائل تھا، مگر تنویر نے ہم زلف کی حیثیت سے اتنے لذیذ پھل کو ایک ہی مکان میں رہتے ہوئے، تنہا کھانا اپنے رئیسانہ اخلاق کے بالکل منافی سمجھا ـــــ ایک مرتبہ جب رمضانی ان دونوں کو دن کا کھانا کھلانے آئی تو تنویر نے بڑی بے ساختگی سے اس کے گداز سینے پر ہاتھ پھیر کر قوی سے کہا ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

کتابوں میں کافی عمر ضائع کی، ذرا اس ثمر بہشت کو بھی تو ٹٹول کر دیکھئے"

ـــــ "نیتاجی" کی بیوی۔ فاروق کی سالی ہی نہیں چچا زاد بہن بھی تھی اور چچا کی موت کے بعد، فاروق کی حیثیت اس خاندان کے سربراہ کی ہو گئی تھی، اس کو جب معلوم ہوا کہ رمضانی "نیتاجی" کے گھر جا کر اس کی سالی کی سیج آباد کئے ہوئے ہے، تو

وہ آتش زیر پا ہو گیا ـــــ وہ ایک رات حامد کے یہاں آیا، اس نے رمضانی کو بلایا، پہلے اُس کو ملائمت سے سمجھایا، پھر سختی سے ڈانٹا "اب تو کسی سے شادی کر کے یہاں سے جا" ـــــ "میں جاہد بابو سے بیاہ کروں گی" رمضانی نے دبی زبان سے کہا ـــــ فارق ایک دم گرجا، "کیا کہا! بیگم صاحب کی اور میری بھاوج بنے گی، دماغ تو تیرا خراب نہیں ہو گیا ہے میں تجھ کو ذبح کر دوں گا" ـــــ "آپ جو چاہیں کریں، میں جیتے جی جاہد بابو کو نہیں چھوڑوں گی! بی بی نہیں، تو ماما بن کر رہوں گی، مگر رہوں گی ان ہی کے پاس" رمضانی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا ـــــ "میں بھی دیکھتا ہوں تو کیسے یہاں رہتی ہے" کہتے ہوئے فاروق وہاں سے چلا گیا ـــــ جب پولیس اور مجسٹریٹ کی طرف سے معاملات ٹھنڈے پڑ گئے یا "نیتاجی" نے اپنے اثر اور اپنی غرض سے ٹھنڈے کرا دیے، تو زاہد پھر شہر واپس آیا، یہاں آ کر اُسے معلوم ہوا کہ رمضانی اب بھی اس کی محبت کا دم، اسی طرح بھر رہی ہے تو وہ اپنی بابت بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا ـــــ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ عورت، اور وہ بھی غریب، اپنے پہلے ہی تعلق کو، ساری زندگی کے لیے آخری تعلق سمجھتی ہے ـــــ اور جب وہ مرد اُس کو دھوکہ دے دیتا ہے تو وہ دربدر ہوتی ہوئی بازار کا مال بن جاتی ہے ـــــ زاہد نے سنا کہ رمضانی ان دنوں نیتاجی کے تصرف میں ہے تو وہ بھاگم بھاگ حامد کے یہاں، رمضانی کے دریائے محبت میں غوطہ لگانے کے لئے پہنچا، مگر وہ تو اب "نیتاجی" کے پاس شیر کے منہ میں بوٹی تھی جو اس کو چھیننے کی کوشش کرتا وہ خود اپنی بوٹی قیمہ کراتا ـ زاہد نے وہاں پہنچتے ہی رمضانی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی "نیتاجی" ٹھہرے فوجی انھوں نے شہزادہ گلفام کو دھنک کر رکھ دیا، وہ بے چارہ پٹا پٹایا اپنے گھر چلا گیا، یہاں اُس کی بہن اور رمضانی اس کا سوگ مناتی رہیں ـــــ دوسرے دن قوی زاہد کی عیادت کے لیے اس کے گھر گیا ـــــ اس کی چوٹ کا حال دریافت کیا، اور پوچھا،

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے، کیا واقعی تم کو رمضانی سے ویسی ہی محبت ہے جیسی اس کو تم سے ہے ــــ بلاشبہ وہ حسن کی دیوی ہے، دو چار نہیں، دس بیس ہزار عورتوں میں وہ بت تراش کی صناعی کا ایک اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی ہے ــ اگر تم اس کو بیوی کی حیثیت سے اپنانا چاہو تو میں اپنی ذمہ داری پر تمہاری شادی اس سے کرا کے جاؤں۔ ــــ زاہد نے کہا، "شادی تو خاندانی معاملہ ہے، اس کو بیوی بنانا تو ممکن نہیں، میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے مکان میں ماما کی طرح رہے، میں اس سے بے توجہی برتوں گا تو وہ خود رفتہ رفتہ مجھ کو بھولنے لگے گی" ــــ قوی نے کہا، "زاہد میاں! یہ شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں، کے قصے چھوڑو، یہ طے ہے کہ میں اس کو بیوی بنا کر ہی واپس جاؤں گا تمہاری، یا کسی اور کی، تم مجھ کو آج شام تک اپنا فیصلہ بتا دو" ــــ زاہد کو تو رمضانی کی گرویدگی کا زعم تھا، اس نے شام تک قوی کے پاس کوئی پیغام نہیں بھیجا ــــ قوی کو اب جلد ہی پاکستان واپس جانا تھا ــــ رات کو، جس وقت روز "نیتا جی" رمضانی کو اپنی خدمت کے لئے طلب کیا کرتے تھے، آج قوی نے اس کو اپنی خوابگاہ میں بلوایا ــــ رمضانی نے سوچا آج بڑے صاحب کی بھی نیت ڈول گئی ــــ وہ تیل کی شیشی لے کر جس طرح روزانہ "نیتا جی" کے کمرہ میں جاتی تھی، آج قوی کی خواب گاہ میں داخل ہوئی، اور اپنے معمول کے مطابق دروازہ بھیڑ دیا، قوی کے قریب جا کر، اس کی ہدایت کے انتظار میں خاموش کھڑی ہو گئی ــــ قوی نے تیل کی شیشی اس کے ہاتھ سے لے لی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پلنگ پر، بالکل اپنے قریب بٹھا لیا ــــ اب رمضانی کو اپنے خیال کی پوری تصدیق ہو گئی ــــ اور آئندہ اقدام کا انتظار کرنے لگی کہ اب اس کا ہاتھ اس کے گال یا سینہ پر کب جاتا ہے ــ مگر اس کو اچانک اپنی پیٹھ پر ایک ملائم سی تھپکی محسوس ہوئی، اور ساتھ ہی اس کے کان میں "بیٹی" کی ایک نامانوس آواز سنائی دی، اس کی

زندگی میں بالکل پہلی بار ـــــ "بیٹی! تو نے آئینہ میں کبھی اپنی صورت دیکھی ہے، اللہ نے تجھ کو حور جیسی شکل دی، صرف ماں باپ تیرے سر سے اُٹھا لئے، اور آج یہ درندے تیرے ساتھ ایک لاوارث کتیا جیسا سلوک کر رہے ہیں، ہر رات اپنی ہوس تجھ سے مٹاتے ہیں، مگر تیرے جسم پر آج آٹھ مہینے کے بعد بھی وہی کپڑا ہے جو تو فاروق کے گھر سے پہن کر آئی تھی، تو نے کبھی یہ بھی سوچا کہ ایک رنڈی کی اگر عزت نہیں ہے، تو اس کی کوئی قیمت تو ہے، تیری تو نہ کوئی عزت ہے، نہ قیمت، ـــ اللہ کا احسان ہے کہ تو اب تک حاملہ نہیں ہوئی، ورنہ ایک "پلے" کو بغل میں دابے گلی گلی بھیک مانگتی پھرتی، اور تیرا یہ سارا حسن جل کر خاک ہو جاتا ـــــ بیٹی! حسن اور جوانی کسی کی ہمیشہ نہیں رہا کرتی۔ عورت کی زندگی کا سودا مرد سے مستقل ہوتا ہے ـــ گیا وقت کبھی لوٹتا نہیں"ـــــ قوی تھوڑی دیر تک خاموش ہو گیا، پھر بولا "زاہد کی بابت تیری رائے مجھے معلوم ہے، مگر تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ـــــ میں آج اس کے پاس اسی غرض سے گیا تھا کہ تیری شادی اس سے کرا کے جاؤں، مگر وہاں تو وہی ہوس پرستی والی بات ہے، شادی تو وہ اپنی برادری ہی میں کرے گا، تجھ کو لونڈی کی طرح ضرور رکھنا چاہتا ہے، تاکہ تیرے حسن وجوانی کی بقیہ دولت بھی بدستور لوٹتا رہے، اور تجھ سے حرام کی ایسی اولاد پیدا کرائے، جس کا کوئی باپ نہ ہو، اور جو تیری کوکھ سے پیدا ہو کر تجھے اپنی ماں کہنے کی بجائے، تیرے وجود کو اپنے لئے لعنت سمجھ کر تیرے منہ پر تھوک دے ـــــ تو غریب ہے، لاوارث ہے، ناسمجھ ہے، تجھے ابھی ان امیرزادوں کے چوچلے نہیں معلوم، ان کے پاس دو قسم کی عورتیں ہوتی ہیں، ایک روایتی بیوی، خاندانی وقار، اور معاشرے میں اپنا مقام قائم رکھنے کے لئے اور دوسری محض لطف اندوزی کے واسطے، جس کو پرانے جوتوں کی طرح، جب جی چاہا تبدیل کر دیا"ـــــ اب قوی نے بڑے پیار سے رمضانی کا چہرہ اپنی طرف

تھا کر، میری بچی! اب بھی وقت ہے سنبھل جا" کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ یکبارگی اس کے سینہ سے لپٹ گئی، اور اس قدر روئی کہ اس کے آنسوؤں سے قوی کا سینہ بالکل تر ہوگیا ۔۔۔ قوی نے اس کو سہارا دے کر اٹھایا تو وہ سسکیوں میں گھٹی ہوئی آواز سے صرف اتنا بولی "آپ باپ ہیں، جو چاہیں کر دیں، ہم کو منظور ہے" ۔۔۔ قوی نے اسی وقت "نیتاجی" کے چپراسی یوسف کو بلایا وہ "نیتاجی" کا باورچی بھی تھا ۔۔۔ اسی طرح جیسے اور افسران کے چپراسی ان کا باورچی خانہ بھی سنبھالتے ہیں ۔۔۔ جب سے رمضانی حامد کے یہاں آئی تھی وہ رات کو تو ان کی جسمانی خدمت انجام دیتی تھی، اور دن میں باورچی خانہ کے کام میں یوسف کا ہاتھ بٹاتی تھی، یوسف اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا تھا جو "نیتاجی" کی منظور نظر کے ساتھ ہونا چاہئیے ۔۔۔ قوی نے یوسف سے پوچھا "تم رمضانی سے شادی کرو گے"؟ وہ ہونق کی طرح قوی کا منہ دیکھنے لگا "حضور رمضانی رانی ہے، وہ بھلا ہم سے کاہے کو شادی کرے گی"۔ قوی نے یوسف سے تفصیلی طور پر اس کے گھر کے حالات دریافت کئے، معلوم ہوا اس کی ماں مرگئی، صرف بوڑھا باپ ہے، اپنا گھر ہے، دو بیل، ایک گائے، اور کچھ کھیت ہے ۔۔۔ قوی نے یوسف سے کہا کہ، اگر وہ رمضانی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اپنے باپ سے پوچھ آئے ۔۔۔ وہ ایک ٹرین سے گیا، دوسری سے واپس آیا، بتایا وہ راضی ہے، اور شادی کے لئے ڈھائی سو روپیہ بھی دیا ہے ۔۔۔ یہاں جوں ہی معلوم ہوا کہ قوی رمضانی کی شادی یوسف سے کر رہا ہے، حامد کی سسرالی والوں کے آگ لگ گئی، ان کو خوف ہوا کہ یہ بلا تو گھر کی گھر ہی میں رہی، اب تو "نیتاجی" کو اپنا مشغلہ جاری رکھنے کی اور زیادہ سہولت ہوگی۔ رمضانی سے پہلے ہی تعلق پیدا ہو چکا ہے، اور یوسف کی تو نوکری ہی اس کے ہاتھ میں ہے ۔۔۔ بس، اب یوسف کے پردے میں "نیتاجی" کی بغل، پابندی سے گرم ہوتی رہے گی ۔۔۔

فاروق اور اس کے عزیزوں نے رمضانی کے لئے ایک دوسرا رشتہ، ایک ہوٹل کے مالک کا ٹھیک کیا، وہ یوسف کے مقابلہ میں صورت شکل کا بھی اچھا تھا، پیسے والا بھی تھا، اور شوقین مزاج بھی ـــــ مگر قوی کا خیال تھا کہ صورت صحت اور پیسہ کے ساتھ، اگر آدمی شوقین مزاج بھی ہو تو کسی بے سہارا عورت کے لئے وہ موزوں رشتہ نہیں ہے ـــــ پھر بھی فاروق کے اصرار پر قوی نے اس کو اجازت دے دی کہ وہ خود رمضانی سے بات کر کے دیکھ لے، تاکہ اس معاملہ میں جو کچھ بھی ہو وہ بالکل اس کی آزاد مرضی سے ہو ـــــ فاروق نے اپنے منتخب کردہ نوجوان کو مع جملہ سامان اور قاضی کے بلایا ـــــ اس نے ایک ماہر وکیل کی حیثیت سے رمضانی کے سامنے پہلے اس خوش رو، خوش پوشاک نوجوان کو، اس کے زیورات اور دیگر گراں قدر سامان کے ساتھ پیش کیا ـــــ اور پھر دیہات کے مقابلہ میں شہری زندگی کی آسائشوں کی ایسی دل کش تصویر اپنے زور بیان سے کھینچی کہ ایک بار خود قوی کو بھی یہ خیال ہوا کہ شاید رمضانی اب اس نئے رشتہ کو قبول کرے گی ـــــ مگر اب رمضانی وہ رمضانی کہاں تھی، وہ تو قوی کے سینہ سے "بیٹی" بن کر لپٹ کر رونے کے بعد بالکل ہی بدل گئی تھی ـــــ فاروق کی طویل بحث کوئی ایک گھنٹہ جاری رہی قوی وہ خاموش کھڑا سنتا رہا ـــــ

فاروق نے آخر رمضانی سے پوچھا۔ اب تو بتا، تو کس سے شادی کرے گی" ـــــ

آج پہلی بار رمضانی کی بلند آواز سنائی دی "یوسوف سے" ـــــ اس فیصلہ پر سب کو حیرت ہوئی، مگر نفسیات کے مدرس کو اپنے اس کامیاب تجربہ پر بڑی خوشی ہوئی کہ ایک جاہل، گم راہ لڑکی کی تباہ شدہ زندگی کا رخ "بیٹی" بنا کر اتنی آسانی سے اس نے صحیح سمت میں موڑ دیا۔ یوسف اور رمضانی کا نکاح اسی وقت فاروق ہی کے لائے ہوئے قاضی نے پڑھا دیا۔ قوی کی روانگی میں اب صرف چار گھنٹے باقی

رہ گئے تھے، دن کے دس بج چکے تھے، ٹرین دو بجے چھوٹتی تھی ــــ آخر وقت میں فاروق کے، اس نئے امیدوار کو، اُس ساز و سامان کے ساتھ، عین موقع پر داخل کر دینے سے، قوی کو ان لوگوں کی نیت میں کھوٹ نظر آنے لگا ــــ اور اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اپنی روانگی سے قبل، اسی وقت دن ہی میں، ان دونوں کی "شب عروسی" بھی کرا دی جائے ــــ اس کا بندوبست ہو گیا ــــ اور یہ نوبیا ہتا جوڑا دو گھنٹہ تک "نیتا جی" کے ہی مکان پر، حجلہ عروسی میں رہا ــــ باہر سب لوگ اس انوکھی قسم کی شادی پر خوش گپیاں کرتے رہے ــــ بارہ بجے کے قریب یوسف اپنی آرام گاہ سے نکل کر قوی کے سامان کو ریلوے اسٹیشن پہنچانے کے انتظام میں مستعدی سے مصروف ہو گیا ــــ قوی نے اس سے پوچھا "تم رمضانی سے مطمئن ہو؟" ــــ وہ ایک دم قوی کے پیروں پر جھک گیا، "حضور! بالکل مطمئن، کہاں میں اور کہاں رمضانی، حضور نے اللہ کے حکم سے ہم کو یہ نعمت دلوا دی، میں اس کو ساری عمر اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا، اللہ حضور کو اس بھلائی کا بدلہ دے گا۔" وہ یہ سب کچھ ایک سانس میں کہہ گیا ــــ قوی نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ رمضانی سے بھی پوچھ لے کہ وہ بھی خوش ہے، معلوم ہوا کہ وہ بھی بہت خوش ہے، کیوں نہ ہوتی؟ ــــ نکاح کے فوراً بعد، دن دوپہر، تھوڑے موافقین اور زیادہ مخالفین، خصوصاً "نیتا جی"، تنویر، اور اس نئے امیدوار کی موجودگی میں، یوسف کے ساتھ "حجلہ عروسی" میں خوش وقتی کے دو گھنٹے گزارنے کے بعد، اندھیری کوٹھری کی لعنت آج رمضانی کی سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی ــــ اب اس کے ضمیر میں، شرعی یا سماجی کوئی کھٹک باقی نہیں رہی ــــ آج اس کا جسم ہی نہیں، روح بھی سیر ہو گئی ــــ اور شوہر اور آشنا کا فرق بھی روز روشن کی طرح اس پر عیاں ہو گیا۔ ــــ قوی جیسے ہی، سب سے ہاتھ ملا کر اسٹیشن روانگی کے لئے کار میں بیٹھا، رمضانی

ایک دم، اپنے اسی بے ترتیب عروسی جوڑے، اور منتشر بالوں میں، بھاگی ہوئی اس کے پاس آئی، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر صرف اتنا کہا "آپ ہمارے باپ ہیں" اور پھر زار و قطار رونے لگی ــــ ظاہر ہے باپ کی سب سے بڑی ذمہ داری بیٹی کے لئے معقول بر ڈھونڈھنا ہی تو ہے ــــ قوی نے بڑے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا "بیٹی! اطمینان رکھ، اللہ نے اب تیری تقدیر بدل دی، بیاہ اپنے جوڑ کا ہی اچھا ہوتا ہے، آج تجھ کو اپنا صحیح جوڑا مل گیا، خدا مبارک کرے!" ــــ حامد کی بیوی سہمی ہوئی، تصویر غم بنی، دور کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی ــــ اب قوی اس سے مخاطب ہوا "بی بی! تم بالکل بے فکر رہو، غریب کو امیر سے زیادہ اپنی عزت کا خیال رہتا ہے، اس کی یہی تو کل پونجی ہوتی ہے ــــ اب تمہارے "نیتاجی" کو رمضانی کی ہوا بھی نہیں لگے گی" ــــ اور واقعتاً معلوم ہوا کہ دوسرے ہی دن یوسف رمضانی کو لے کر اپنے گاؤں چلا گیا، وہاں اس کے بوڑھے باپ کا دل، چاند سی بہو دیکھ کر، باغ باغ ہو گیا ــــ اور وہ اس کو "رانی" کہہ کر پکارنے لگا ــــ شہر کی رمضانی گویا شہر ہی میں رہ گئی، گاؤں میں اپنے صحیح مقام پر پہنچکر وہ "رانی" بن گئی۔ دل کی رانی، اور گھر کی رانی ــــ قدرت نے بھی اس کو پھل دینے میں دیر نہیں کی ــــ جلد ہی اس کے یہاں، یکے بعد دیگرے، دو لڑکے پیدا ہو گئے ــــ بچے نہیں، لڑکے! ــــ

ــــ ⁘ ــــ

ٹیوٹر

شیریں فاروق بیرسٹر کی لڑکی تھی۔ فاروق کی تعلیم انگلستان میں ہوئی، مگر اس کے خیالات، عقائد، ثقافت و تہذیب پر، وہاں کی آب و ہوا کا۔ کوئی اثر نہیں پڑا، اس نے روزہ نماز ترک نہیں کیا، اور نہ اپنے ساتھ وہاں سے کوئی میم لایا، بلکہ یہاں آکر، سنت رسول کی تقلید میں، ایک بیوہ سے شادی کی وکالت بھی کی، ججی بھی کی۔ مگر اپنے کردار، اور اصول زندگی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ سیرت کی طرح صورت بھی، اللہ نے اس کو نہایت پاکیزہ دی تھی، بچی بھی باپ کی ہم شکل پیدا ہوئی، بچے اور بھی ہوئے، مگر لڑکی کوئی دوسری نہیں ہوئی۔ شیریں کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی، ماں سے زیادہ باپ خود، اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور خواہشوں کا ہر وقت خیال رکھتا۔ لیکن اس نے بچی کی بے جا ضد کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی ——— بیوی کو اپنے دائرۂ اختیار میں پوری آزادی حاصل تھی۔ مگر شیریں کی تعلیم و تربیت کو فاروق نے اپنی مخصوص ذمہ داریوں میں شامل کر دیا تھا ———

بی۔ اے تک تو شیریں نے گرلز کالج میں پڑھا مگر ایم۔ اے کے لئے یونیورسٹی جانا تھا، اور فاروق کو مخلوط تعلیم پسند نہیں تھی، اور شیریں کے خیال میں بی۔ اے کی قدر، روپیہ کی قیمت کی طرح گھٹ کر، انٹرنس کے برابر ہو گئی تھی، بات معقول تھی، فاروق نے اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لئے، یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملاقات کی۔

ان سے مشورہ کیا، ان کی رائے ہوئی کہ، اس صورت میں شیریں کو، پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم - اے کے امتحان میں شریک کرایا جائے، اور اس سلسلہ میں، امتحان کی تیاری کے لئے وائس چانسلر نے خود اپنے اسٹاف میں سے ایک اچھا ٹیوٹر بھیجنے کی پیش کش کی، فاروق نے اس تجویز کو بہت پسند کیا البتہ ٹیوٹر کے بابت یہ شرط رکھی کہ، استعداد بھی اچھی ہو، تو بڑی اچھی بات ہے، مگر کردار، بہر صورت، بہت اچھا ہونا لازمی ہے ـــــ ہفتہ کے اندر اندر حامد نے شیریں کی کوچنگ کا کام شروع کر دیا ـــــ وائس چانسلر نے حامد کو، فاروق کے یہاں بھیجنے سے قبل، اس کے اصول اور خیالات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا ـــــ حامد بڑی مستعدی سے، دو سال تک، اپنا کام کرتا رہا، اور بظاہر اس کا کام، اور اس کا رویہ، بہت اطمینان بخش تھا۔ شیریں کے فائنل امتحانات ختم ہو گئے، اور اس کے ساتھ ہی حامد کی کوچنگ کا سلسلہ بھی۔ نتیجہ ابھی شائع نہیں ہوا تھا کہ، ایک روز بالکل اچانک، فاروق کے گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کسی اتفاق سے، حامد کا ایک خط شیریں کے نام، فاروق کی ڈاک میں آ گیا، فاروق حامد کی تحریر سے آشنا تھا، اسے کچھ شبہ ہوا، کھول کر پڑھا تو شبہ کی تصدیق ہو گئی۔

فاروق، حامد کی اخلاقی بنیاد کو، اپنی طرح مستحکم سمجھے ہوئے تھا۔ اچانک اپنے اعتماد کو اس طرح مجروح ہوتا دیکھ کر اس کو سخت صدمہ ہوا۔ اس نے وہ خط اپنی بیوی کو دے دیا۔ اور آج پہلی بار شیریں سے خود گفتگو کرنے کے بجائے، اس کی ماں سے کہلوا دیا کہ یہ قصہ اب یہیں ختم ہو جانا چاہیئے ـــــ ماں بیٹی میں، اس مسئلہ پر، کئی روز تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ شیریں اپنے فیصلہ پر قائم رہنے پر مصر تھی ۔ اس کی دلیل تھی کہ اس نے کوئی بات خلاف شرع نہیں کی ہے - اور نہ وہ کسی بد اخلاقی کی مرتکب ہوئی ہے، وہ جائز طور پر، ایک معقول آدمی کو، جس سے وہ دو سال سے اچھی طرح واقف ہے۔

اپنا شریکِ حیات بنانا چاہتی ہے ـــــ اسے تو سخت تعجب تھا، کہ جس شخص نے اس کی بیوہ ماں سے اپنی شادی کر کے اس قدر فراخ نظری اور ایثار کا ثبوت دیا، وہ آج خود اپنی ہی بیٹی کے رشتے کے معاملے میں اس قدر تنگ نظر کیسے ہو گیا ـــــ یہ اختلافی مسئلہ اس قدر طول کھینچا کہ باپ بیٹی کے درمیان، نہ صرف بول چال بلکہ سلام و پیام کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ـــــ بیوی جب شیریں کو سمجھا کر تھک گئی۔ تو اس نے فاروق کو ہی بیٹی کے فیصلہ کو قبول کر لینے پر آمادہ کرنے کی، انتہائی کوشش کی ـــــ مگر فاروق نے اس کو مختصر سا جواب دے کر خاموش کر دیا، اس نے کہا، "تم کو معلوم ہے کہ میں نے ججی کیوں چھوڑی، جب کہ مجھ سے قبل، ایسے جج بھی گزرے ہیں، جنہوں نے کسی دباؤ یا مصلحت کے تحت کوئی فیصلہ غلط دے دیا، اور پنشن پہ جانے وقت، تاسف کے ساتھ، خود اس کی تاویلیں پیش کیں۔ پھر تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے تم سے شادی کیوں کی۔ جب کہ تم بیوہ تھیں، اور مجھ سے عمر اور رشتہ، دونوں لحاظ سے بڑی تھیں" ـــــ شیریں کی ضد بدستور قائم رہی تو ماں نے ایک بار پھر وائس چانسلر صاحب کو، اس قصہ میں، اپنی اعانت کے لئے بلایا۔ انھوں نے بھی پہلے شیریں سے رجوع کیا، وہاں مایوسی ہوئی تو فاروق کو سمجھانا شروع کیا۔

"حامد، مالی اعتبار سے۔ اس وقت ضرور کمزور ہے۔ مگر یہ وقتی بات ہے، وہ جلد ہی، اپنی قابلیت کی بنا پر کسی اعلیٰ عہدے پر منتخب ہو جائے گا، خاندان بھی معقول ہے" ـــــ فاروق نے وائس چانسلر کو یقین دلایا کہ وہ غربت اور امارت کا بالکل قائل نہیں۔ اصل سوال کردار کا ہے، استاد اور شاگرد کا رشتہ بڑا مقدس ہے، باپ بیٹے کی طرح، اس رشتہ کو، اس قسم کے جذبات سے کسی صورت میں آلودہ نہیں ہونا چاہئے، یہ لغزش استاد سے ہو، یا شاگرد سے۔ نہایت قابل اعتراض ہے، یہ انفرادی نقصان نہیں، معاشرہ کی ایک اعلیٰ قدر کی تباہی کا سوال ہے، جس کی تائید وہ کم از کم اپنے

ٹھکرانے سے، گرانا قطعاً پسند نہیں کرتے، یوں اُسے شیریں کی پسند کا کوئی اور رشتہ قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا ــــ فاروق نے، اس درمیان میں اپنے طور پر شیریں کے لئے ایک اعلیٰ نوجوان افسر کا رشتہ پسند بھی کر لیا تھا، جس کی منظوری، اپنی بیوی کے ذریعے، وہ شیریں سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ابھی تک اس کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ باپ بیٹی کی یہ گتھی، کسی طرح سلجھتی نہ دیکھ کر بیگم فاروق کو اپنے وہ بھائی یاد آئے، جو پولیس کی ملازمت سے کسی علت میں برخاست کر دیئے گئے تھے۔ ان کو تار دیا گیا، اور مقصود دوسرے روز آ گئے۔ ان کو سارے حالات بتائے گئے۔ انہوں نے اس کام کو معمولی شمار کیا، اور بہن کو اطمینان دلایا کہ شیریں سے فاروق کی پسند کے رشتہ کی منظوری جلد مل جائے گی ــــ مقصود نے اپنی پولیس والی کارروائی شروع کر دی، وہ حامد کے پاس آ گیا۔ اس سے کہا کہ شیریں اور اس کی ماں تم سے رشتہ کرنے پر بالکل تیار ہیں۔ مگر فاروق شیریں کا رشتہ کہیں اور طے کر چکا ہے۔ اس کو سرانجام دینے میں صرف ایک خیال مانع ہے۔ اس کو یہ خوف ہے کہ تم شیریں کے وہ خطوط جو تمہارے پاس ہیں اس لڑکے کو کسی وقت بھیج دو گے ــــ ان خطوط کو تم سے حاصل کرنے کے لئے فاروق نے شیریں کو سمجھایا ہے کہ، اگر وہ اپنے خطوط تم سے حاصل کر لے، تو وہ خوشی سے شیریں کی شادی تم سے کر دے گا۔ ورنہ اس کے خیال میں، یہ شادی کھلی ہوئی بلیک میلنگ ہوگی، یہ بات شیریں کی بھی سمجھ میں آ گئی ہے ــــ آخر، باپ باپ ہے اور لڑکی پھر لڑکی، اور وہ بھی ایسی لڑکی جو پیدائش سے اب تک، باپ کی آنکھ کا تارا بن کر رہی ہے۔ وہ کہاں تک اس کی دل آزاری کرے گی۔ ــــ مقصود نے حامد کو مزید بتایا کہ وہ جلد ہی وہاں بلایا جائے گا، اور شیریں خود، اپنے باپ کی یہ شرط پیش کرے، اپنے خطوط واپس مانگے گی "یہی موقع تمہارے لئے فیصلہ کن ہوگا ــــ اگر تم نے وہ خطوط شیریں کو دے دیئے تو شیریں ہمیشہ

سکے لئے تمہارے ہاتھ سے گئی۔" مقصود نے حامد کو اچھی طرح ذہن نشین کرادیا کہ اس کے حصول مقصد کی کنجی صرف شیریں کے وہ خطوط ہیں۔ حامد کو اچھی طرح شیشے میں اتار کر مقصود اب شیریں کے پاس آیا، اس نے شیریں کے خیالات سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا، اور اس کو بتایا کہ میں اس معاملہ کو، خوش اسلوبی سے طے کرانے کی غرض سے، حامد کے پاس خود گیا تھا، اور اس کو سمجھایا کہ، بجائے اس کے کہ بیٹی کے ذریعے باپ پر دباؤ ڈال کر، رشتہ حاصل کرو، اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ فاروق کے پاس جاکر، اپنی لغزش کی تلافی کرا کے، مروجہ مہذب طریقہ پر، ان سے رشتہ کی درخواست کرو، یہ بھی تو سوچو کہ جس لڑکی نے تمہارے لئے اتنا کچھ کیا ہے، اس کی نسوانی وقار کی پاسداری بھی تو تمہارا فرض ہے۔ مگر حامد کو تو کچھ اور ہی زعم ہے اس نے دھمکی کے انداز میں کہا: "آپ بالکل فکر نہ کریں، میرے پاس شیریں کے ایسے خطوط ہیں، جن کی موجودگی میں۔ آج نہیں تو کل فاروق صاحب شیریں کی شادی مجھ سے کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

مگر شیریں حامد کی اس قدر معتقد تھی کہ اس نے مقصود کے اس بیان کو سرے سے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر مقصود نے نہایت دلیری سے شیریں کو یہ پیش کش کی کہ "حامد کو ابھی بلوائے دیتا ہوں، تم خود اس سے اپنے خطوط واپس مانگ کر میرے بیان کی تصدیق کرلو۔" حامد بلایا گیا۔ شیریں نے اپنے باپ کی شرط کا ذکر کر کے، اس سے اپنے خطوط واپس مانگے۔ اور حامد کو معاً مقصود کی پیشین گوئی کا خیال آگیا، اس نے حیلہ حوالہ شروع کر دیا کہا، "کچھ خطوط تعطیل میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔ کچھ یہیں تلف کر دیئے ہیں۔" اب شیریں کو مقصود کے بیان کی روشنی میں حامد کے خلوص پر شک ہونے لگا۔ اس نے حامد سے مزید اصرار کیا۔ مگر وہاں وہی عذر۔ بس شیریں ایک دم بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھی، اور یہ کہتی ہوئی ڈرائنگ روم

سے نکل گئی کہ "یہ بات ہے، تو اب آپ ان خطوط ہی سے شادی کریں"۔۔۔۔۔۔ اور اندر جا کر ماں سے کہا کہ "آپ ابا سے کہہ دیں، کہ وہ جو رشتہ تجویز کر چکے ہیں کر دیں، مجھے ان کا فیصلہ منظور ہے"۔

چلئے حامد کی دو سال کی بنی بنائی عمارت منٹوں میں، عشق مست د ہزار بدگمانی، کی زد میں آ کر زمین دوز ہو گئی ۔۔۔ فاروق نے شیریں کی رضامندی حاصل ہوتے ہی محمود کے رشتہ کی منظوری اس کے والد کو لکھ دی ۔۔۔۔۔۔ اور دوسرے ہی دن کی ڈاک سے شیریں کے حامد کو لکھے ہوئے خطوط کا ایک بنڈل براہ راست، محمود کے پاس پہنچ گیا۔ محمود نے جس کی تعلیم بھی انگلستان میں ہوئی تھی۔ وہ تمام خطوط، اپنی ایک مختصر سی تحریر کے ساتھ، فاروق کے پاس بھیج دیئے۔ لکھا کہ "یہ کسی منچلے کی مایوسانہ حرکت ہے۔ آپ ان خطوط کو شیریں کے حوالہ کر دیجئے۔ اور ان سے، میری طرف سے، کہہ دیجئے کہ مجھے ان کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہے، شادی کے بعد، اگر وہ میرے ساتھ، ایک باوفا بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتی ہیں تو ۔۔۔۔۔۔ چشم ماروشن دل ماشاد"۔

اور ضمیر جاگ اٹھا

حفیظ بھی عجیب مقدمہ لے کر آیا تھا۔ اس کے پیدا ہوتے ہی ماں مرگئی، دو برس کا ہوا تو باپ بھی قضا کر گیا۔ مشکل سے آٹھ برس کا تھا کہ چچی، جس نے اسے گود لے رکھا تھا، چلتی بنی۔ اب مسعود چچا ہی باپ بھی تھے، ماں بھی، اور چچی اماں بھی۔ مسعود نے دوسری شادی کی، اس کی اور نئی بیوی کی عمر میں باپ بیٹی کا فرق تھا۔ اور اسی لحاظ سے نئی چچی کے رعب میں زیادتی۔ اللہ کی شان کہ بڑی چچی تو بانجھ مریں ۔۔ اور چھوٹی نے آتے ہی بچوں کی لائین لگادی۔ بیٹی اور پھر بیٹا، بیٹی اور پھر بیٹا۔ ابھی ایک دودھ نہیں چھوڑتا کہ دوسرا آدھمکتا۔ اتنے سارے بچوں کو اکیلی چچی کو سنبھالنا ناممکن ہوگیا۔ ان کی ماں کے یہاں بھی اللہ کے فضل سے اپنی ہی پیداوار تھی۔ کوئی آدھا درجن کنواریاں، رشتوں کے انتظار میں وہاں سوکھ رہی تھیں، چچی نے اپنے بچوں کی دیکھ بھال میں ہاتھ بٹانے کے لئے مسعود کو ایک ترکیب بتائی۔ ان کے دفتر میں ایک کلرک کی بیوی ایک لڑکی چھوڑ کر مرگئی تھی۔ چچی نے اپنی ایک بہن کی شادی اس سے کرانی تجویز کی، مقصود کو دوسری شادی تو کرنی تھی۔ پھر ہیڈ کلرک کی سالی سے اچھا رشتہ کہاں ملتا۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر مسعود کی سالی آگئی۔ مقصود کا گھر بس گیا۔ اور مسعود کے بچوں کی پرورش کی دقت بھی دور ہوگئی۔ مقصود کی نو بیاہتا بیوی کے ساتھ اس کی مرحومہ بیوی کی لڑکی نجمہ بھی آئی۔

اس سے مسعود کے بچوں کی پرورش میں اور بھی آسانی ہو گئی۔ اب دونوں بہنیں۔ رانی، مہارانی بنی گھر میں راج کرتیں۔ اور بیچاری نجمہ آیا کی طرح بچوں کی نگہداشت کرتی، بے اُجرت کی آیا۔ جس کی خدمت کا معاوضہ صرف ڈانٹ ڈپٹ تھا۔ حفیظ کو نجمہ کے ساتھ یہ سلوک بہت برا لگتا۔ اس کو اس پر سخت ترس آتا۔ آخر اس کو بھی تو اپنی ماں کی محرومی کا تلخ احساس تھا۔ اس کی زندگی میں صرف بڑی چچی ہی نے اس کی ماں کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد تو حفیظ بھی اپنے کو نجمہ ہی جیسا سمجھنے لگا۔ اس طور پر اب یہ دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر بن گئے۔ نئی چچی حفیظ کو اپنی سوت کی اولاد سمجھتی تھیں۔ مسعود چچا اپنے طور پر اس کی ضروریات کا ضرور خیال رکھتے تھے۔ بھائی کی یتیم اولاد سمجھ کر، ہونہار طالب علم دیکھ کر، اس کی خدمت گذاری کا خیال کر کے، یا کسی خاص دور اندیشی کے پیشِ نظر، مگر ان کی توجہ تو خارجی ضروریات تک ہی محدود رہتی تھی۔ داخلی معاملات تو کلیتہً ان کی نئی بیوی کی خوشنودی پر ہی منحصر تھے۔ اور ان کی نگاہ میں حفیظ اور نجمہ دونوں ہی اس مکان میں ناخواندہ مہمان کی حیثیت رکھتے تھے۔ نجمہ کو تو خیر وہ اپنے بچوں کی کھلائی سمجھ کر گوارا کر بھی رہی تھی مگر حفیظ کو تو وہ اپنے لڑکوں کا فریق شمار کرتی تھی۔ مسعود برابر چاہتا کہ حفیظ، کم از کم شام کا کھانا، اس کے ساتھ ہی کھائے۔ مگر ان کی بیوی، کوئی نہ کوئی عذر نکال کر، مسعود کو تنہا ہی کھانا کھلا دیتی کبھی کہتی حفیظ ابھی کالج سے نہیں آیا۔ کبھی کہتی وہ کالج سے آ کر کھیلنے چلا گیا۔ مسعود اس راز کو جلد ہی سمجھ گیا۔ مگر عمر رسیدہ شوہر اپنی نوجوان بیویوں کی اس طرح کی حرکتوں کی نشاندہی کرنے کی جرأت نہیں رکھتے، حفیظ کو معمولاً بعد مغرب، نجمہ کے ہاتھ، اس کے کمرہ ہی میں کھانا بھیجدیا جاتا۔ اس صورت سے حفیظ کو اکثر مسعود سے بھی بہتر کھانا پہنچتا۔ خصوصاً رات کو وہ جتنی دیر میں آتا اتنا ہی

عمدہ کھانا اس کو ملتا۔ بعض روز تو اسے اچھی خاصی دعوت کا مزہ آجاتا، پہلے تو اسے چچی کی اس دریا دلی پر بڑی حیرت ہوئی۔ مگر جب اس نے غور کیا کہ جس روز نجمہ کے علاوہ کوئی اور اس کا کھانا لاتا ہے تو وہ بس یوں ہی سا ہوتا ہے تو وہ فوراً سب کچھ سمجھ گیا۔ اور اس کے دل پر نجمہ کی اس خاموش خدمت کا بڑا اثر ہوا۔ اور اپنی اس کوتاہی پر افسوس بھی کہ وہ جوابی طور پر اس حسن سلوک کا کوئی معاوضہ اسے نہیں دے پا رہا ہے۔ نجمہ میں نہ کوئی غیر معمولی حسن تھا نہ شوخی، نہ دلربائی کی ادائیں۔ وہ ایک سیدھی سادی دل شکستہ لڑکی تھی۔ حفیظ کو اپنا ہم حال سمجھ کر اس کی جو خدمت اس کے بس میں تھی وہ کرتی تھی۔ اور اس طرح پر وہ اپنے جذبۂ یگانگت کی تسکین کر رہی تھی۔ ایک روز اچانک چچی کے میکے سے ان کے والد کی سخت علالت کا تار آیا، چچی اور ان کی بہن بچوں کو ساتھ لے کر باپ کی عیادت کے لئے فوراً چلی گئیں۔ نجمہ کو گھر سنبھالنے کے لئے چھوڑ گئیں آخر، مسعود، مقصود اور حفیظ کے کھانے پینے کا انتظام کو کرنا ہی تھا۔ اور پھر نجمہ کا ان کے والد سے کوئی تعلق بھی تو نہیں تھا۔ وہاں چند دنوں کے بعد بڑے صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور یہاں اسکولوں میں گرمیوں کی عام تعطیل ہو گئی۔ لہٰذا ان لوگوں کا وہاں قیام بڑے صاحب کے چہلم تک بڑھ گیا۔ حفیظ کے ایم۔ اے کے فائنل امتحانات قریب تھے۔ یونیورسٹی میں تیاری امتحان کی چھٹی تھی۔ دن میں خاصی گرمی پڑنے لگی تھی۔ اس لئے وہ رات کو کافی دیر تک پڑھتا اور دن میں دو تین گھنٹے کے لئے سو جاتا۔ ایک روز وہ زکام اور اعضا شکنی کی وجہ سے دیر تک سوتا رہا۔ نجمہ اس کو کھانے کے لئے جگانے گئی، دیکھا کہ وہ سر میں رومال باندھے ہوئے لیٹا ہے! پوچھا "کیا سر میں درد ہے"؟ حفیظ نے کہا۔ "یوں ہی معمولی سا ہے"۔ نجمہ اس کا سر دبانے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد حفیظ نے اس سے کہا۔

"اب ٹھیک ہے تم جاؤ" مگر وہ بدستور اس کا سر دبا تی رہی - اور اب حفیظ کو شاید آرام کے بجائے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی - اس نے نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر سے علیحدہ کرنا چاہا - لیکن اس کا ہاتھ تھامتے ہی اس کو معلوم ہوا جیسے سانپ جیسی کوئی بڑی ملائم سی چیز اس کے ہاتھ میں آگئی - اس نے فوراً اس کو جھٹک دیا، مگر سانپ کو ڈسنے کتنی دیر لگتی ہے - حفیظ کے سارے بدن میں معاً ایک لہر دوڑ گئی - اس کا دماغ دفعتاً معطل ہو گیا - اور ایک عجیب سی بدحواسی کے عالم میں اس نے نجمہ کو اپنی آغوش میں بھر لیا - جب ہوش آیا تو دونوں کے چہرے عرقِ انفعال سے بری طرح تر تھے - نجمہ ایک گھائل شکار کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی - دروازے پر ٹھوکر لگی، اور وہ گرتے گرتے بچی، جاتے ہوئے اس کی آنکھیں سرخ، اور گال آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے - زخمی نجمہ کی یہ حالت دیکھ کر حفیظ نے محسوس کیا کہ اس نے ایک بے سہارا لڑکی کو، جس نے اس کو اپنا محافظ جانا، نہایت بے دردی سے قتل کر دیا، اس کے احساسِ جرم کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی - اس کی بھوک اور نیند بالکل غائب ہو گئی - وہ جب بھی سونے کی کوشش کرتا اسے خواب میں خون کے دھبے نظر آتے - اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا - اس کی یہ حالت مستقل رہی - اسی دوران میں اس کی چچی اور نجمہ کی سوتیلی ماں اپنے میکے سے واپس آگئیں - اور گھر کی زندگی بظاہر اپنے معمول پر چلنے لگی - دو چار مہینے گذر گئے - نجمہ اپنی بدنصیبی پر چھپ چھپ کر آنسو بہاتی رہی مگر حفیظ سے کوئی حرفِ شکایت اپنی زبان پہ نہ لائی - خاموشی سے بدستور اس کی خدمت کرتی رہی - حفیظ سے اس طرح کی لغزش کا پھر کوئی اعادہ نہ ہوا - مگر وہ اپنے ضمیر میں مستقلاً ایک ٹیس محسوس کرتا رہا - جانے کیا کیا خیالات اس کے دماغ میں آتے رہتے - وہ سوچتا آخر یہ اتنا بڑا جرم اس سے کیونکر ہوا - اسے بار بار خیال آتا کہ اس کی ماں، اس کی پیدائش ہی کے وقت مر گئی تھی اس کی

بہن کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی! شاید وہ اسی وجہ سے ایک "مریم" کی عصمت کی قدر نہ کر سکا۔ وہ ان ہی ذہنی پریشانیوں میں مبتلا تھا کہ ایک دن اس کے ایم۔اے کا نتیجہ آگیا۔ اور وہ تھوڑی سی دوادوش کے بعد کسٹمز کے محکمہ میں ملازم ہو گیا۔ چشم زدن میں اس کی یتیمی کے دن بدل گئے، مالی طور پر اس کو فراغت نصیب ہوئی۔ تو اس نے چچا اور چچی کی خدمت دل کھول کر کرنا شروع کر دی۔ اور اب چچی وہ چچی نہیں رہیں، وہ تو مرحومہ چچی سے بھی زیادہ اس کی محبت کا دم بھرنے لگیں۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ حفیظ کے رشتے بھی ایک سے ایک بڑھ کر آنے لگے۔ لیکن اب تو چچی خود اس کی ساس بننے کا خواب دیکھ رہی تھیں، وحیدہ بھی تو شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ اس نے مسعود سے اس کا ذکر کیا تو مسعود نے اس کو بتایا کہ وہ تو یہ رشتہ اپنے ذہن میں وحیدہ کی پیدائش کے دن ہی سے طے کئے ہوئے ہے۔ خود حفیظ کو اس کا کہاں تک علم تھا۔ یہ تو معلوم نہیں۔ مگر نجمہ واقفیت، خدشہ، یا محض قیاس کی بنا پر، اس واقعہ کی بہت پہلے سے متوقع تھی۔ وحیدہ کی شادی کے انتظامات جب شروع ہو گئے تو جیسے یکبارگی حفیظ کا ضمیر جاگ اٹھا۔ اور اس نے خاموشی سے چچا کو لکھا "میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ ہی کو باپ جانا ہے۔ اور آپ نے بھی مجھ کو اولاد ہی سمجھا ہے۔ میں نے آپ کی خوشی کو ہمیشہ اپنی مرضی پر ترجیح دی ہے۔ مگر آج وقت ہے کہ آپ اپنی مرضی پر میری خوشی کو ترجیح دیں۔ اپنی شادی کی بابت آپ سے مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں جب بھی شادی کروں گا، صرف نجمہ سے کروں گا۔ ورنہ کروں گا ہی نہیں۔" یہ خط مسعود کو گولی کی طرح لگا۔ مگر وہ تیس سال کا پولیس کا ملازم تھا۔ اس چوٹ کو برداشت کر گیا۔ اور بات کی تہہ کو فوراً ہی پہنچ گیا۔ بیوی نے بہت واویلا مچایا۔ اس نے اس کو سمجھایا کہ بہت سی باتیں صرف مردوں ہی کے سمجھنے کی

ہوتی ہیں، تھوڑے سے آرام کی لالچ میں آدمی کو اکثر زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ مگر اچھا جواری بازی ہار کر شور نہیں مچاتا۔ مقصود کی بیوی اور بیٹی کو معمولی سی سہولت کے لئے اتنے عرصہ تک اپنے مکان میں رکھا گیا۔ آج اس سہولت کی قیمت ادا کرنی ہے اس میں اگر پس وپیش کیا گیا تو بلا یا پلا یا ہونہار لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بھتیجہ تو بھتیجہ ہے، ایسی صورت میں تو خود اپنی اولاد کے سامنے بھی سپر انداز ہونا پڑتا ہے۔ مسعود نے اپنی بیوی کو تحمل کی تلقین کی، وہ اللہ کے راز اللہ ہی جانتا ہے، بے ماں باپ کا لڑکا اپنی سلامت روی سے اس درجہ پر پہنچ کر نجمہ جیسی بے سہارا لڑکی کو سہارا دے رہا ہے، کون جانے کل اللہ اسی کے ہاتھوں وحیدہ کا بھی پار گھاٹ لگوا دے۔" مسعود کی جلد ہی پنشن ہونے والی تھی۔ خود اس کے لڑکے ہونہار نہیں تھے۔ اور حفیظ نہایت کشادہ دلی سے اپنی اولاد کی طرح ان لوگوں کی خدمت کر رہا تھا۔ بیوی کی سمجھ میں اس کی بات آگئی۔ اور کل تک جس نجمہ کو وہ آیا، کھلائی، اور خادمہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ آج سرخ عروسی جوڑے میں اسی دلہن کی وہ سر سے پیر تک بلائیں لے رہی تھی۔ جیسے سچ مچ حفیظ کی اپنی مرحومہ ماں، قبر سے اٹھ کر اپنی بہو کی بلائیں لینے آگئی ہو۔ آج سے مقصود کی نجمہ "حفیظ دلہن" پکاری جانے لگی۔ نجمہ کی ٹوٹی ہوئی کشتی اب اسی ناخدا کے ہاتھوں میں لہراتی بل کھاتی دریائے عیش و راحت میں رواں دواں ہوگئی۔ سات سال کی کلفتیں سات دن میں نجمہ کے ذہن سے ایسی محو ہوگئیں جیسے اس نے کبھی کوئی پریشانی برداشت ہی نہیں کی تھی۔ چار سال تک وہ حفیظ کے دل کی ملکہ بن کر عیش کی بنسی بجاتی رہی۔ پھر ایک دن وہ اپنی ماں کی روائت دہرا کر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اور ایک بچی اپنی اور حفیظ کی محبت کی نشانی چھوڑ گئی۔ اچانک بچی بھی چند ہی مہینے بعد کوئی ایک درجن

بچے چھوڑ کر نجمہ کے پاس چلی گیئں ۔ مسعود کی پنشن ہو گئی ۔ عمر اور صدمہ نے ان کو بالکل چور کر دیا ۔ ایک حادثہ میں وہ اپنا ایک پیر بھی توڑ بیٹھے ۔ بدنصیبیاں تو ایک ساتھ آتی ہیں ۔ اتنے بڑے کنبہ کا بار، معمولی پنشن ۔ اپنے لڑکے بے روزگار، وحیدہ ابتک کنواری، مسعود بالکل بدحواس ہو رہا تھا ۔ ادھر حفیظ نجمہ کی بے پناہ محبت کی یادگار اور اس کی صغیر سن بچی کی پرورش کے خیال سے یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اب دوسری شادی کرے گا ہی نہیں ۔ مگر چچا کو اس ابتلا کی حالت میں دیکھکر اس کو ان کی خدمات یاد آئیں ۔ اور آج وہ خود آگے بڑھا ۔ وحیدہ کا ہاتھ تھام لیا ۔ اور چچا کے کنبہ کی سربراہی قبول کر لی ۔ چچا نے صرف اس کی پرورش کی تھی ۔ اس نے ان کے سارے کنبے کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی ۔ اور وہی کنبہ جہاں نجمہ اپنے باپ کی موجودگی میں سوتیلی ماں کے سایہ میں آیا بن کر پلی ۔ اور زندگی کے بدترین حادثہ میں مبتلا ہو گئی ۔ اس کی بیٹی اسی گھر میں سوتیلی ماں کی موجودگی میں پھول کی طرح پلی اور شہزادی کی طرح بیاہی گئی ۔ آج حفیظ اپنے ضمیر میں بڑا سکون محسوس کرنے لگا ۔!

ہاتھی کے دانت

آج بھی ٹرین بہت لیٹ تھی، پلیٹ فارم مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ٹرین آئی تو ہر ڈبہ پارسل وین بنا ہوا تھا، جس میں مسافر، تازہ پھل کی ٹوکریوں کی طرح ٹھٹھے اوپر، ٹھنسے ہوئے تھے، کچھ ڈبوں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے، کچھ فٹ بورڈ پہ لٹک رہے تھے —— اب نئے مسافروں کے داخلہ کی کہیں بھی کوئی گنجائش نہیں تھی، پھر بھی کچھ انتہائی ضرورت مند، قلیوں کی مدد سے کھڑکیوں کے راستے، ڈبوں میں داخل ہونے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے۔ اس جدوجہد میں کسی کا سر اندر ہوتا، اور پیر باہر، اور کسی کا پیر اندر ہوتا اور سر باہر۔ ان کی یہ بدحواسی دیکھ کر برجستہ ظریف لکھنوی مرحوم کا یہ شعر یاد آجاتا کہ ؎

گزرا تھا مسافروں کی عجب یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

بارے ٹرین نے سیٹی دی، اور افراتفری کے عالم میں، کچھ مسافروں کو رکھ کر اور زیادہ کو چھوڑ کر، وہ اپنی منزل پر گامزن ہوگئی، ٹرین اپنا وقت پورا کرنے کے لئے، مقررہ رفتار سے کافی تیز جا رہی تھی۔ ابھی وہ دوچار ہی اسٹیشن کی مسافت طے کرپائی تھی کہ ایک چھوٹے اسٹیشن پہ، جوں ہی گاڑی رکی، زنانہ انٹر میں ایک کہرام سنائی دیا، معاً ہر ڈبہ سے مسافر نکل کر وہاں دوڑ پڑے۔ معلوم ہوا ایک نوجوان ہندو لڑکی،

پانچ سال کی ایک بچی کو لے کر سفر کر رہی تھی۔ وہ بچی پچھلے اسٹیشن کے آوٹر سگنل کے پاس، کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اچانک باہر گر پڑی ــــــ لڑکی زار وقطار رو کر اسٹیشن ماسٹر کو پکار رہی تھی، اور ہر سیاہ سوٹ پہنے ہوئے شخص کو اسٹیشن ماسٹر سمجھ کر، اس سے اپنی مصیبت نہایت رقت آمیز طور پر بیان کرنے لگی تھی۔

بارے اسٹیشن ماسٹر آ گئے، انہوں نے لڑکی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ پچھلے اسٹیشن سے تار آیا ہے، بچی زندہ ہے، صرف تھوڑی سی چوٹ آئی ہے دو تین گھنٹہ میں اس طرف سے ایک مال گاڑی آ رہی ہے، اس سے وہ بچی آ جائے گی۔ بہتر ہے۔ آپ اس وقت یہیں اتر جائیں ــــــ لڑکی کا سامان اتارنے کے لئے قلی آگے بڑھے۔ اور وہ بے تابانہ چیخ پڑی۔ آنسوؤں کی یورش سے اس کی گھگھی بندھ گئی، اس نے گھٹی ہوئی آواز میں، بڑی عاجزی سے، اسٹیشن ماسٹر سے کہا "اس بپتا میں آپ میرے حال پہ دیا کریں، یہ کنیا میری بھتیجی ہے، ابھی تھوڑے دن ہوئے اس کے پتا لڑائی میں مارے گئے ہیں" اس کی ماتا اپنے میکے میں بہت بیمار ہے، میں اس کو لے کر اسی کے پاس جا رہی ہوں، چلتے سمے میں نے اس کو تار دیدیا ہے۔ میں اس گاڑی سے نہیں گئی تو وہ لوگ بہت اچیت ہوں گے، تار دیتی ہوں، یا اکیلی چلی جاتی ہوں تو، اس کی بیمار ماتا پتی کی موت کی ماری، پاگل ہو جائے گی، جانے دم ہی تیاگ دے۔ آپ ہمارے دھرمی بھائی ہیں، اس کشٹ میں ہم پر اتنی دیا کریں کہ بچی کو کسی اُپائے سے ترنت منگا دیں۔ تاکہ وہ جس دشا میں ہو میں اسے لے کر اسی گاڑی سے اس کی ماتا کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں آپ کا یہ اُپکار کبھی نہیں بھولوں گی ــــــ

یہ بالکل ناممکن ہے۔ اسٹیشن ماسٹر اور گارڈ ایک ساتھ بول

اٹھے ——— "یہ بالکل ناممکن ہے" دفعتاً کوئی نوجوان مجمع کو چیر کر آگے بڑھا، "بچی ابھی آئے گی، اور اس وقت تک ٹرین نہیں جائے گی ——" فوراً اسٹیشن ماسٹر، گارڈ اور اس لڑکی کی اچٹی آنکھیں، صورت سوال بن کر نوجوان کے چہرے پر جم گئیں ـــ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا "آپ کون ہیں؟" "ایک انسان!" "تو پھر آپ یہ حکم کیسے دے رہے ہیں" اسٹیشن ماسٹر نے اعتراض کیا —— اور لمحہ بھر قبل لڑکی کے ڈوبتے ہوئے دل میں جو اچانک امید کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، وہ دفعتاً یہ سوچ کر کہ ایسی صورت میں صرف ایک انسان کسی کی کیا مدد کرسکتا ہے، ڈوب گئی —— اسی دوران میں نوجوان نے اسٹیشن ماسٹر کو سمجھانا شروع کیا "اس خاتون نے رعایت چاہی، اس میں آپ کو عذر ہوا، میں اب حق کا مطالبہ کرتا ہوں، اس کی انجام دہی آپ کا فرض ہے" —— "وہ کیسے؟" —— نوجوان فوراً آگے بڑھا۔ اور اسٹیشن ماسٹر کو زنانہ انٹر کے پاس لے آیا۔ "اس ڈبے کا ویکیوم بریک ذرا ملاحظہ کیجئے۔ بالکل قطع ہے۔ بچی کے گرتے ہی عورتیں اس ڈبہ میں چین کھینچ چکیں، ان کی چیخ سن کر میں نے بھی اپنے متصل ڈبہ سے چین کھینچی، مگر ٹرین نہیں رکی، اڑی چلی آئی، اگر ویکیوم بریک ٹھیک ہوتا۔ تو ٹرین وہیں رک جاتی، اور بچی اٹھالی جاتی اب ایسی صورت میں ریلوے کو اپنی کوتاہی کے عوض، رعایت نہیں، حق کے طور پر اس خاتون کی مدد کرنی چاہیے ———" "مگر وہ کیوں کر؟" اسٹیشن ماسٹر نے سوال کیا —— "یہ تو آپ بہتر سوچ سکتے ہیں —— میرے خیال میں تو، اگر اور کوئی صورت فی الوقت ممکن نہیں ہے، تو انجن کو ہی بھیج کر بچی کو منگا دیجئے" "ٹرین کو اتنی دیر تک یہاں روکنا، اور انجن کو واپس بھیج کر بچی کو منگانا، اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ شاید آپ خیال کر رہے ہیں، ہمارے اختیارات بہت محدود ہیں، اس سے تجاوز کرنا

ہمارے لئے دشوار ہے" اسٹیشن ماسٹر نے معذرت کی —— مگر قبل اس کے کہ نوجوان مزید کچھ کہتا اینگلو انڈین گارڈ، انگریزی لہجہ میں مخل ہوا "یہ بس نہیں، ریلوے ٹرین ہے، کمپنی کی نہیں، اسٹیٹ کی" —— "جی!" نوجوان بھی اب ذرا تیز ہوا "آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ مگر شاید آپ نے یہ غور نہیں کیا کہ اسٹیٹ نے انسان کو نہیں بنایا، انسان نے اسٹیٹ کو بنایا ہے، اور اسٹیٹ نے ریل کو، اور ان دونوں کی تخلیق کی غرض انسان کی خدمت کرنا، اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے ——" اسٹیشن ماسٹر کو خوف ہوا کہ مبادا نوجوان اور گارڈ میں یہ نظریاتی بحث کسی بدمزگی کی صورت نہ اختیار کرے، اس نے نوجوان کو اپنی طرف مخاطب کیا "مگر بڑی زحمت یہ ہے کہ ہمارے پیروں میں قانون کی بیڑیاں ہیں ....." "قانون کو آپ کیوں بدنام کرتے ہیں" نوجوان نے قطع کلام کیا "وہ تو ایک زہریلی دوا ہے۔ اس کا صحیح استعمال زندگی بخشتا ہے، اور غلط جان لے لیتا ہے، اس موقع پر ریلوے سے بڑی چوک ہوگئی ہے۔ اول تو جبکہ تمام انکوائری رپورٹ کی سخت تنبیہ کے باوجود "یہ ٹرین" اپنا وقت پورا کرنے کے لئے، مقررہ رفتار سے بہت تیز جاری ہے۔ اور دوم اس کا ویکوم بریک ناکارہ ہے، اب آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان خاص حالات کے پیش نظر، اپنے اختیار تمیزی سے کام لے کر اس دشواری کا کوئی حل نکالیں ——" ابھی نوجوان نے اپنی گفتگو ختم نہیں کی تھی کہ گارڈ اپنی اینٹھی زبان میں پھر مخل ہوا "یہ کاؤنسل چیمبر نہیں، بحث وہاں کرنا، یہ ریلوے پلیٹ فارم ہے، لیڈی کو اترنے دو، نہیں تو ہم ٹرین چھوڑتا ہے ——" "یہ بات ہے" نوجوان کا چہرہ، ایک دم سرخ ہوگیا "ٹرین تو آپ بے شک لے جا سکتے ہیں، مگر ہم کو تو اس میں چلنے کے لئے آپ مجبور نہیں

کر سکتے"، یا اس کے لئے بھی کوئی قانون ہے، یہ ٹرین ہماری ایک چھوٹی سی دنیا ہے، جہاں ہم ایک دوسرے کی پریشانی میں ساتھ دینے کے لئے مجبور ہیں، ہماری غیرت ہرگز یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس نوعمر کنواری لڑکی کو، اس سنسان اسٹیشن پر، اس حادثہ کی حالت میں، شام کے وقت، تنہا چھوڑ کر چلے جائیں، یہاں دن میں رہنا مشکل ہے: رات یہ کیسے کاٹیں گی، اگر آپ ان پر قانون کی آڑ میں ظلم کریں گے۔ تو ہم آپ کا ہاتھ تو نہیں پکڑ سکتے۔ مگر ہم اپنا ہاتھ، اس کام کے لئے، آپ کے ہاتھ میں تو نہیں دیں گے، ہم انسان ہیں، حیوان نہیں، ہماری زندگی میں کچھ ایسی بنیادی قدریں ہیں۔ جن کی حفاظت کرنے میں، ہم اپنے اور غیروں میں کوئی فرق نہیں کرتے، ہم انسانیت کے فرائض کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں ـــــ" لڑکی کی سسکیاں اب ذرا تھم گیئں، مگر آنسو بدستور رواں تھے، ہونٹ کانپ رہے تھے، اور وہ ایک عجیب آس اور یاس کی حالت میں، مستقل ٹکٹکی باندھے، نوجوان کو دیکھ رہی تھی ـــــ نوجوان اب اس سے مخاطب ہوا، "آپ ذرا بھی نہ گھبرائیں، ہرگز یہ نہ خیال کریں کہ آپ تنہا سفر کر رہی ہیں، مانا آپ کا اور ہمارا خون ایک نہیں۔ مگر روح تو ایک ہے۔ خون جم سکتا ہے، روح کو فنا نہیں، عزیز و اقارب کسی کے بھی ہر وقت ساتھ نہیں رہ سکتے، مگر انسانیت جب تک زندہ ہے، ہر جگہ بے طلب امداد ملے گی، انسانیت کی دنیا سیاست کی دنیا سے بالکل مختلف ہے، آپ یہ بھی نہ سمجھیں کہ میں تنہا ہوں یہ سارا مجمع آپ کے ساتھ ہے۔ صرف ان کے پاس میری ایسی زبان نہیں ہے، ورنہ دل ہر ایک کے پاس میرا ہی جیسا ہے، یہ سب آپ کا خاندان ہے، اگر اس وقت آپ کو یہاں اترنا پڑا تو آپ کو ابھی میرے دعویٰ کا ثبوت مل جائے گا ـــــ"، اسی دوران میں گارڈ نے سیٹی بجادی، اور

نوجوان نے لپک کر اپنا سامان اتارنا شروع کر دیا، اور اس کی تقلید میں ہر ڈبہ سے لوگوں کا دھڑا دھڑ سامان اترنے لگا۔ چشم زدن میں پلیٹ فارم اچھا خاصا مال گودام بن گیا ــــــ اب اسٹیشن ماسٹر اور گارڈ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ نوجوان کے تیور دیکھ کر ان دونوں کو خوف ہوا کہ وہ اس مجمع کو لے کر اب انجن کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھنے کا پروگرام بنا رہا ہے ــــــ اسٹیشن ماسٹر بھاگا ہوا اپنے دفتر میں گیا، وہاں سے اس نے شاید اپنے اعلیٰ افسروں سے رابطہ قائم کیا ــــــ بارے انجن کھولا گیا۔ وہ پچھلے اسٹیشن کے لئے روانہ ہوا، اسٹیشن ماسٹر کی اجازت سے وہ نوجوان بھی اس میں سوار ہو گیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں بچی آ گئی، نوجوان نے بچی کو لڑکی کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "بچی بالکل ٹھیک ہے، کوئی خطرہ نہیں ہے، چوٹیں سطحی ہیں۔ بچی صرف دہشت سے رو رہی ہے" ــــــ لڑکی نے بچی کو بے تابانہ لپٹا لیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ــــــ ٹرین اب روانہ ہو گئی ــــــ اگلے اسٹیشن پر لگی تو نوجوان پھر زنانہ انٹر کے پاس آیا، اس نے لڑکی کو آواز دی "دیوی جی! مجھے یہیں اترنا ہے، لیکن اگر آپ ضرورت سمجھیں تو میں آپ کے مکان تک بھی پہنچا سکتا ہوں ــــــ" "میرا نام مالتی ہے" لڑکی نے پہلی بار نوجوان سے تخاطب کیا: "آپ ایک دیوتا ہیں، آپ مجھے دیوی نہ کہیں" "بس آپ کا یہ اُپکار اپنے جیون میں کبھی نہیں بھولوں گی، اب آپ زیادہ کشٹ نہ اٹھائیں، دو تین اسٹیشن کی بات ہے، اور آپ نے تو ساری ٹرین ہی کو میرا ساتھی بنا دیا ہے۔ میری پرارتھنا ہے کہ پرماتما آپ کو سدا سکھی رکھے" یہ کہتے کہتے مالتی کی آنکھیں بری طرح ڈبڈبا آئیں، اور اس کی آواز بھرا اٹھی، اس نے اپنی ساڑی کے آنچل سے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا ــــــ "مالتی دیوی!" نوجوان نے اس کو

تسلی دی "آپ روئیں نہیں، مجھے اس سے سخت تکلیف ہو رہی ہے" ——
مالتی نے اپنے جذبات پہ قابو پاکر سسکتی ہوئی دھیمی آواز میں، رک رک کر کہا۔
"آپ کے اُپکار کے بدلے میں —— جو دھنیواد کے شبد ——
میں کہنا چاہتی ہوں —— وہ زبان تک نہ پہنچ کر —— کیول آنکھوں کے
ہی راستے نکل رہے ہیں ——" اس فقرے سے نوجوان پر بھی رقت طاری
ہو گئی —— اُس نے اپنے آپ کو ضبط کر کے مالتی کو تشفی دینے کی کوشش کی۔
"اگر آپ اس کو میرا احسان سمجھتی ہیں تو گویا آپ کے خیال میں میں انسان سے
گری ہوئی کوئی ہستی ہوں ——" "نہیں، نہیں!" مالتی تیزی سے بول پڑی۔ "میں
تو آپ کو دیوتا سمجھتی ہوں ——"
"یہ بھی غلط ہے" نوجوان نے انکساری سے اس کو اپنی حقیقت بتانے
کی کوشش کی "میں صرف ایک انسان ہوں، اور بس" "اس وقت میں نے
جو کچھ کیا ہے۔ وہ میرا انسانی فرض تھا آپ زیادہ سے زیادہ مجھے اپنا فرض ادا
کرنے پہ مبارک باد دے سکتی ہیں۔"
یہ گفتگو جاری تھی کہ ٹرین چھوٹ گئی، مالتی اور بچی دونوں نے کھڑکی سے باہر
سر نکال کر، اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر نوجوان کو سلام کیا —— مالتی کے گلابی
رخساروں پر آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی، بچی کے معصوم چہرہ پر بھی آنسوؤں کے
قطرے موتی کی طرح بکھرے ہوئے تھے —— معاً نوجوان نے اپنا رومال اپنی
آنکھوں کی طرف اُٹھایا، اور پھر اسے ہوا میں ٹرین کی طرف لہرانے لگا ——
بچی نے چلتی ہوئی ٹرین سے زور سے پکارا "آپ نے اپنا شبھ نام تو بتایا ہی
نہیں!" —— نوجوان نے بدستور رومال ہلاتے ہوئے بلند آواز میں جواب
دیا —— "مشفق، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ" —— اور یک بہ یک "مسلم لیگ

زندہ باد، قائداعظم زندہ باد! پاکستان زندہ باد!" کے فلک شگاف نعروں سے پلیٹ فارم گونج اٹھا ــــ اور ایک بڑا مجمع جو پھولوں کے ہار، اور مسلم لیگ کے جھنڈے لیے ہوئے کسی مہمان کو مختلف ڈبوں میں ڈھونڈ رہا تھا، مشفق کے گرد جمع ہوگیا ــــ مشفق اب بھی اپنا رومال، الوداعی انداز میں، ٹرین کی جانب ہلا رہا تھا اور مالتی، ایک عجیب مبہوت حالت میں، اپنی کھڑکی سے پلیٹ فارم کے اس منظر کو، اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھ رہی تھی ــــ ٹرین پوری رفتار سے بھاگنے لگی، اور اسی تیزی سے مالتی کے دماغ میں جانے کتنے خیالات دوڑنے لگے ــــ مشفق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم ہے! ــــ یہ جناح کا پیرو ہے! یہ مسلم لیگ کا کارکن ہے! ــــ یہ اس وقت بھی اسی تحریک کے سلسلہ میں سفر کر رہا ہے، پھر بھی اس نے اتنی شرافت اور اتنی انسانیت کا سلوک ایک ہندو لڑکی کے ساتھ، ایسی حالت میں کیا، جب کہ خود اس کے اپنے سارے اپنے بھائی کوئی پیش قدمی نہیں کر رہے تھے ــــ بات تو یہ چھوٹی سی ہے، مگر معمولی نہیں، انسان کا چھوٹا چھوٹا عمل، بڑے بڑے قول سے زیادہ، اس کی شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمارا پریس، ہمارے لیڈر، ہمارے اُستاد، علی گڑھ کے طالبعلموں کو گنڈہ کہتے ہیں ــــ گنڈوں کی کیا یہی شکل ہوتی ہے؟ اپنے مخالفوں کے ساتھ ان کا یہی سلوک ہوتا ہے ــــ ہمارے لیڈر کہتے ہیں کہ پاکستان کبھی نہیں بن سکتا، اور اگر بن بھی گیا تو چل نہیں سکتا، وجہ؟ ــــ ایک جناح آخر کب تک؟، وہ تو اپنی عمر پوری کر چکے، اس کے بعد کیا ہوگا ــــ؟

مگر کیا مشفق جیسے ان کے ہونہار کارکن، آگے چل کر، خود جناح نہ بن جائیں گے، پھر پاکستان کا بننا کون روک سکے گا، اور بن گیا تو کیوں قائم

نہیں رہے گا ــــــ حریف کو کمزور سمجھنا بڑی بھول ہے۔ اور وہ بھی جناح جیسے قدآور لیڈر کو ــــــ

مگر اپنے نہرو جی، تو کہتے ہیں کہ ہم جناح سے اب گفتگو ہی نہیں کریں گے ــــــ پیتھک لارنس سے، اسٹفورڈ کرپس سے، لارڈ ویول سے، تو وہ گفتگو کر سکتے ہیں اور جناح سے نہیں، آخر کیوں؟ ــــــ اور اگر اس قومی الیکشن میں ہندوستان کے سارے مسلمانوں نے جناح ہی کو اپنا نمائندہ چن لیا تو پھر کیا ہوگا ــــــ مگر ہمارے لیڈروں کی بات کا کوئی ٹھکانہ نہیں ــــــ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں ــــــ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں، دکھانے کے اور ــــــ

تیر بہدف نسخہ

آج صبح ہی سے محمد پور میں بہت چہل پہل تھی، ریلوے اسٹیشن سے آنے والی پختہ سڑک پر، دو رویہ، سرخ و سبز کاغذ کی ان گنت جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں، اور جگہ جگہ کیلے کے پتے کے خوشنما محراب بنے ہوئے تھے، اُن پر سنہرے کاغذ کے دیدہ زیب "خوش آمدید" لکھے ہوئے بینر ہوا میں لہرا رہے تھے، انکی گذرگاہ پر بار بار پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا، معلوم ہو رہا تھا، جیسے کسی بڑے رئیس کی بیٹی کی بارات کی آمد آمد ہے ——— اس چھوٹے سے قصبہ کی تاریخ میں آج بالکل پہلی بار صوبہ کا ناظم تعلیمات، لڑکیوں کے ایک چھوٹے سے مدرسہ کی نئی پختہ عمارت کی رسم افتتاح کرنے خود آ رہا تھا ———

آج تمام بچیاں، اپنی بہترین پوشاک میں ملبوس، اپنی اپنی جگہوں پر، صورت تصویر بنی بیٹھی تھیں، اگلی صف میں ایک چھوٹی سی بچی، بالکل موم کی گڑیا جیسی، بڑی خوش الحانی سے، قرآن پاک پڑھ رہی تھی ——— ڈائرکٹر ناظم کچھ دیر اُس کے پاس کھڑے ہوئے اُس کی تلاوت سنتے رہے، پھر پوچھا "یہ کس کی بچی ہے؟" ——— صدر معلمہ بولی "گاؤں کے زمیندار خالد صاحب کی" ——— زمینداری تو خالد کی کبھی کی مہاجنوں کی نذر ہو چکی تھی، کچھ خود کاشت، اور ایک آم کے باغ پر اُن کا گذارہ تھا، کنبہ بھی مختصر تھا۔

میاں، بیوی، اور یہی ایک بچی — بیوی سگھڑ تھیں، سب کچھ خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں، پائی پائی پہ نظر رکھتی تھیں، خود تکلیف اُٹھاتی تھیں، مگر میاں اور بچی کو تنگی ترشی کا احساس نہیں ہونے دیتی تھیں، گھریلو زندگی میں فراغت بالکل نہیں تھی، مگر خالد میاں باہر خاندانی روایات پہ آنچ آنے دینے کے متحمل نہیں تھے، وہ اب بھی گاؤں میں زمیندار اور ٹھاکر ہی کہلاتے تھے، بڑے بڑے کاشتکار، جو ہر اسوں میں کھیل رہے تھے، اُن کی چوپال پر آکر، اُن کے سامنے زمین پہ ہی بیٹھتے تھے، اور اُن کے لڑکے، لڑکیوں کی شادی کے موقع پہ، پرانی ریت کے مطابق، دولھا خالد کے ٹوٹے ہوئے صدر پھاٹک کی دہلیز پہ سجدہ ریز ہوکر، اُن کی چھوٹی سی بیٹی کو نذرانہ پیش کرتا تھا — اس رکھ رکھاؤ کو قائم رکھنے کے لئے خالد اور اُن کی بیوی کو جانے اپنی کتنی ضروریات کی قربانی دینی پڑتی تھی، گاؤں میں سب کی خوشی غمی میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر شرکت کرتے تھے، چھوٹا بڑا جو بھی افسر اس گاؤں میں آتا وہ خالد ہی میاں کا مہمان ہوتا، خواہ وہ گاؤں کا پٹواری، اور ڈاکیہ ہو، یا ضلع کا کلکٹر، فرق صرف اتنا ہوتا کہ ہندوستانی اہل کار اُن کے اپنے مہمان خانہ میں ٹھہرتے، اور انگریز افسران اُن کے باغ میں کیمپ میں قیام کرتے — مگر اُن کی ساری رسد، از قسم گھی، دودھ، دہی، گوشت، مرغی، انڈے، خالد میاں ہی کی طرف سے وہاں پہنچتے — اس طور پہ اُن کو ضلع کے تمام افسران کا تقرب حاصل تھا، اور اُن کی شکستہ حالی کے باوجود، گاؤں والوں کی نگاہ میں، اُن کی روایتی وجاہت کا چراغ بدستور روشن تھا — وہ گاؤں کے مکھیا تھے، نام کے سہی، مگر زمیندار تھے، اور سب سے بڑھ کر اس

مدرسہ کے منیجر تھے، پھر وہ ڈائریکٹر تعلیمات کی، عزت اس موقع پر، اُن کی شایان شان طور پر، کیوں نہ کرتے ___ یوں تو وہ خاصے زن مرید تھے، بیوی کو اپنی عقل کل سمجھتے تھے، اُن کی منشا کے خلاف ایک قدم نہیں اُٹھاتے تھے، بس اک مہمانوں کی تواضع کے معاملہ میں اُن کی کچھ نہیں سنتے تھے، یہی اُن کی ایک کمزوری، یا بیوی کے مقابلہ میں مضبوطی تھی ___ بیوی نے ذرا خفگی سے سمجھایا کہ اب وقت بدل گیا ہے، حالات کا کچھ بھروسہ نہیں، آخیر عمر میں اللہ نے ایک بچی بھی دیدی ہے، بڑا کچا ساتھ ہے، زمانہ اب نفسی نفسی کا آن لگا ہے، ذرا عاقبت اندیشی سے کام لو ___ خالد میاں نے اُن کو پیار سے رام کرنے کی کوشش کی "دل چھوٹا نہ کرو، اتنے بڑے صوبہ کا ڈائریکٹر تعلیمات، سلطنت برطانیہ کے دور میں، پہلا مسلمان، تمہارے اِس چھوٹے سے گاؤں میں، اس چھوٹی سی تقریب میں، خود آیا ہے، اس موقع پر اگر اس کی پذیرائی معقول طور پر نہ ہوئی تو دنیا کیا یہ نہیں کہے گی کہ ہم علم اور عہدہ کی نہیں، صرف انگریز کی دہونس کی قدر کرتے ہیں، یعنی ذہنی طور پشتینی غلام ہیں، پیٹ تو خوش حال بدحال سب ہی پال لیتے ہیں، مگر خاندانی وقار ایک دن میں نہیں حاصل ہوتا، جلا البتہ ہی ایک دن میں ہی جاتا ہے، اور جب وقار چلا جاتا ہے، تو آدمی کنگال ہو جاتا ہے، اور کنگال کا اس دنیا میں رہنا، نہ رہنا برابر ہے ___ رہا روزی کا سوال، تو ہم تو بزرگوں کے اس قول کے قائل ہیں کہ عورت کے قدم سے روزی ہے، اور جب تک تم جیسی بھاگوان کی راجدھانی اس گھر میں ہے، مجھے اللہ کے بھروسہ پر روزی کی کوئی فکر نہیں . . . . . ." بیوی جانتی تھیں میاں تو لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے کے عادی ہیں، جو بات اُن کے ٹانٹ میں جم جائے نکلتی نہیں،

وہ اُن کی اس وضعداری کو تسلیم کیا کرتی تھیں، مگر اُن کے پیار اور شستہ برتاؤ سے ہمیشہ مات کھا جاتی تھیں ___ اس موقع پر بھی وہی ہوا، اور جو کچھ اُنہوں نے سال بھر کے لئے اکٹھا کیا تھا اس دعوت میں، میاں کی خوشنودی کے لئے، خرچ کر دیا ___ ڈائریکٹر صاحب" اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ" دعوت میں تشریف لائے، اُن کا دس سالہ، اکلوتا بیٹا ہاشم بھی اُن کے ساتھ تھا، کھانا ختم ہوا، اس موقع پر دیہاتی رقص و سرود کا بھی انتظام تھا، کہ گاؤں والے بھی اس دعوت کا ٹھاٹ دیکھ لیں، اور یہ سمجھ لیں کہ اس گاؤں کی جو کچھ بھی بھرم ہے وہ صرف خالد میاں کے ہی دم سے ہے ___ یہ پروگرام شروع ہونے والا ہی تھا کہ عابدہ، چاندی کے منقش خاصدان میں، نقرئی ورق میں لپٹی ہوئی گلوریاں لے کر، زنان خانہ سے نکلی، اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے، سیدھے ڈاکٹر کاظم کے پاس پہنچی، نہایت مؤدبانہ سلام کر کے پان پیش کئے ___ کاظم نے اُس کے ہاتھ سے پان کی طشتری لے کر آگے بڑھا دی، اور عابدہ کو اُٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا، اور خالد سے مخاطب ہوتے ہوئے "معاف کیجئے میں نے پان تو کبھی کھایا ہی نہیں، حتیٰ کہ اپنی شادی میں بھی نہیں، البتہ گلاب کا پھول مجھے بے حد پسند ہے، کیا آپ یہ گلاب مجھے اپنی کوٹھی کی زینت بڑھانے کے لئے عنایت کر دیں گے، میری بڑی عزت افزائی ہوگی" ___ اس گفتگو میں لطیف اشارہ تھا کہ اس گلِ نادمیدہ کی صحیح جگہ یہ کچی حویلی نہیں، سنگ مرمر کی کوٹھی ہے ___ وہ زمانہ ڈگریوں کا نہیں تھا، لڑکیاں خاندانی شرافت، نجابت، اور اپنے حسن صورت و سیرت سے قدردانوں کی نگاہ میں کھبتی تھیں ___ خالد کاظم کی اس اچانک پیش کش پر بھونچکا رہ گیا، دونوں نجیب الطرفین ضرور تھے، مگر علم، مال، مرتبہ، اقتدار کا تفاوت زمین آسمان کا

تھا، لیکن وہ جو کہا ہے کہ ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے

—— لڑکیوں کا رشتہ عموماً خواتین ہی طے کرتی تھیں، مگر خالد اس وقت کچھ اتنا بوکھلا گئے تھے کہ انھوں نے بیوی سے مشورہ کی مہلت بھی نہیں مانگی، سوچا اللہ نے، ساری عمر کاٹ کر، ایک اولاد دی، وہ بھی بیٹی، پیر کی بیڑی، خاندانی رئیس کی بیٹی کا اٹھنا، اور ہاتھی کا باندھنا ایک چیز ہے۔ مگر اللہ نے اپنی کریمی سے پانچ ہی سال کی عمر میں، غیب سے اس بیڑی کے کٹنے کا انتظام کر دیا، اس موقع پر کوئی بھی تامل کفران نعمت ہے، اُس نے جواب دیا "اب آپ نے اپنی گود میں لے ہی لیا ہے تو پھر آج سے یہ آپ ہی کی لڑکی ہے" —— دس یا پانچ سال کے یہ دونوں بچے، اس گفتگو کو کچھ بھی نہیں سمجھ سکے، مگر ان کی ساری زندگی کا رشتہ دو فقروں میں طے ہو گیا —— رشتے تو پرانے عقائد کے مطابق اللہ ہی کے یہاں سے طے ہو کر آتے ہیں، یا کم از کم اُس وقت آتے تھے —— ابھی ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی ریت نہیں پڑی تھی، بات پر البتہ زبان کٹتی تھی، تحریر کا رواج کم تھا، وہ صرف بہ وقت ضرورت کام آنے کے لئے ہوتی تھی، ورنہ روزمرہ کی زندگی میں قول مرداں جان دارد کا سکہ چلتا تھا —— جب یہ بچے سن شعور کو پہنچے تو خاصے اہتمام سے ان دونوں کی منگنی ہو گئی، انگوٹھیوں کے تبادلے ہوئے، اور ہاشم و عابدہ رواجاً اب ایک دوسرے کے ہو گئے، صرف شرعی دو بول پڑھانے باقی رہ گئے تھے کہ ڈاکٹر کاظم اور اُن کی بیوی، اپنی دونوں لڑکیوں کو اُن کے ماموں زادوں سے بیاہ کر، فریضۂ حج ادا کرنے چلے گئے —— واپسی پر ہاشم کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرنے کا پروگرام تھا، مگر من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال، کاظم کو

اللہ نے جنت البقیع میں ہی جگہ دے دی، اور اُن کے گھر کا سارا انتظام تہس نہس ہو کر رہ گیا، وہ گئے تو صرف خود، اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے، مگر آج یہ کوٹھی بے سرداری ہو گئی، بیگم کاظم کے دل پر تو خوب راج کرتی تھیں مگر اُن کی جمی جمائی سلطنت کو نہیں سنبھال سکیں، کاظم کی آنکھ بند ہوتے ہی اُن کی بیوی کے بھائیوں نے اپنی ریشہ دوانی شروع کر دیں، اُن کی دونوں لڑکیاں تو اپنے بیٹوں سے نبٹ ہی چکے تھے، اب ہاشم کو بھی اپنانا چاہتے تھے، موقع کی تلاش میں تھے کہ ایک روز خالد نے بیگم کاظم سے تعین تاریخ کی تحریک کی، بس بیگم صاحب کے بھائیوں نے شگوفہ چھوڑا "ابھی تو آپ کے سہاگ کو اُجڑے ہوئے سال بھر بھی نہیں ہوا، ابھی تو مرحوم کا کفن بھی قبر میں میلا نہیں ہوا ہوگا، اور ان یار غار کو اپنی بیٹی کے سہرے کا پھول کھلا دیکھنے کی آرزو جاگ اُٹھی — ہم لوگ تو دوڑ دھوپ کر رہے ہیں کہ کاظم کے سارے متروکات ہاشم کی شادی سے قبل، آپ کے نام منتقل ہو جائیں، تاکہ آپ کی زندگی تک تو "گلاب محل" پر آپ کا اقتدار قائم رہے، ورنہ اُترا شحنہ، مردک نام، پھر کون کس کو پوچھتا ہے، مگر خالد کو تو عجلت ہے کہ اُن کی لاڈلی جلد سے جلد اس کوٹھی کی مالکہ بن جائے — خالد کے پاس زمینداری تو باقی نہیں ہے، مگر اُس کے ہتھکنڈے اُن کو خوب معلوم ہیں، اور افسروں میں اُن کی خاصی پہنچ ہے، شادی ہوتے ہی وہ سب کچھ ہاشم کے نام منتقل کرانے کی پوری کوشش کریں گے اُس وقت اگر آپ نے عذر کیا تو اکلوتے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی"۔ عورت عورت ہے، پھر بیوہ، زیور اور جائیداد اُس کی بڑی کمزوری ہوتی ہے — وہ اپنے بھائیوں کی گفتگو میں آگئیں، پوچھا "تو پھر میں کیا کروں؟" —

"کہہ دیجئے مجھے ابھی دو چار سال ہاشم کی شادی نہیں کرنی ہے، اور نہ میں

یہ کہہ سکتی کہ میرے حالات کب اِس کی اجازت دیں گے، ایسی صورت میں میں آپ کی لڑکی کو پابند کرنا نہیں چاہتی، لہٰذا آپ میری طرف سے اس منگنی کو منقطع سمجھیں"۔ — یہ اعلان ہاشم اور عابدہ پر بجلی بن کر گرا، اُن دونوں کے خرمنِ آرزو میں آگ لگ گئی، اُن کی بارہ سال کی بسی بسائی دنیا آنِ واحد میں اُجڑ گئی — ہاشم کے ننھیال میں گھی کے چراغ جلنے لگے، اُس کی دونوں بہنوں کی طرح اُس پر بھی قبضہ کرنے کی راہ کھل گئی — غریب عابدہ تو دم بخود تھی ہی، بائیس سالہ ہاشم، وکالت کا طالب علم بھی، اپنی جگہ سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف تو ایسی حور شمائل بچپن کی منگیتر جس کو بارہ سال قبل "اُس کا جہاندیدہ باپ" ایک نگاہ دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا، اُس کے نہاں خانۂ دل میں دھنسی بیٹھی تھی، دوسری طرف بیوہ ماں کی حکم عدولی کا سوال تھا، ایک طرف دل اُجڑتا تھا، تو دوسری طرف گھر، اور جنت بھی — وہ چاہتا تھا کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ سانپ بھی مر جائے، اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، مگر اُس کی ماں اپنے بھائیوں کے حصار میں ایسی گھری ہوئی تھی کہ اُس کو صرف خالد ہی توڑ سکتا تھا — مگر وہاں صورتِ حال اور بھی پیچیدہ تھی، خالد نے کاظم کو بیوی کے مشورہ کے بغیر زبان دے دی تھی، اب جو یہ منگنی ٹوٹی تو اُس کی بیوی کے سامنے اُس کی بڑی ہیٹی ہوئی "دیکھا تم نے، تمہاری اس وسیع النظری کا آج یہ حشر ہوا، ساری زندگی کی آبرو پہ پانی پھر گیا، رشتے بھی کہیں یوں چلتے پھرتے طے ہوتے ہیں، لڑکی بھی کوئی کھونے کا مال ہے، جس نے مانگا، اُٹھا کر دے دیا — خیر، جو ہوا سو ہوا، میں اب بیگم کاظم کو بتاؤں گی کہ دولت ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی، حسن بھی ایک دولت ہے، جہاں بڑے بڑے طرم خان سجدہ ریز ہو جاتے ہیں — میں اپنی بچی کو لے کر اپنے میکے جاؤں گی، موڑ کے گاہک جنگل میں

نہیں، شہر میں ملتے ہیں، اس شعلہ جوالہ کو وہاں پہنچنے کی دیر ہے، پھر تم یہاں
بیٹھے ہوئے اپنے پاس رشتوں کی بھیڑ دیکھنا" بیوی طیش سے بھری ہوئی بولتی
جارہی تھیں، خالد خاموش سُن رہے تھے، وہ تو یوں بھی بیوی کے مرید تھے" اور
اس وقت تو چوٹ کھا گئے تھے ___ مگر اپنے وقار کا خیال کرکے، یا شاید بیٹی کے
دل کی کچھ دھڑکن سن کر" انھوں نے پھر ایک بار بیوی کو رام کرنے کی کوشش کی "بیگم!
مجھے بڑائی کا کوئی دعویٰ نہیں ہے، میں تو ایک بے حیثیت انسان ہوں، موروث
ساری جائیداد عیاشی کی بھینٹ چڑھا گئے، پھر بھی تمھارے قدم کی برکت سے
مٹھی بھر سیر و خود کاشت کے سہارے، اب بھی اس علاقہ کا زمیندار بنا
بیٹھا ہوں، اور تمھارے علاوہ کوئی دوسری ہستی نہیں جو مجھ سے آنکھ ملانے
کی جرأت کرسکے ___ صرف تمھاری اجازت کی دیر ہے، بیگم کاظم کے بھائیوں
کی بنی بنائی بساط، آن واحد میں، اُلٹ کر رکھ دوں گا، اور ہاشم میاں،
دوسرے روز، سہرا باندھے، تمھارے آنگن میں کھڑے ہوں گے" ___
بیگم یہ سنتے ہی ایک دم بھڑک اُٹھیں "بس، بس، خبردار! اب اُس گھر کا
نام نہ لینا، میں مر کر بھی اپنی بچی کو وہاں نہیں جانے دوں گی، مجھے اپنی عزت
نیلام نہیں کرنی ہے ......" ماں کا یہ قطعی فیصلہ سن کر عابدہ کی رہی سہی
امید نے دم توڑ دیا ___ ہاشم کی طرف سے بھی کوئی امید افزا خبر نہیں
آرہی تھی، بجز اس کے کہ اُن کے ماموں، اور خالہ کے درمیان، اپنی اپنی لڑکیوں
کے رشتہ کے لئے آپس میں رسہ کشی ہو رہی ہے، نانا نواسی کے حق میں ہیں،
اور نانی پوتی کی سفارشی ___ ہاں خود نیوٹرل ہیں، اور ہاشم کا کاسٹنگ
ووٹ ابھی تک کسی کو نہیں ملا ہے ___ ادھر بیگم خالد اپنے میکے چلنے کی
تیاری کررہی تھیں کہ وہاں سے اُن کے بھائی ایک ولایت پلٹ نوجوان بیرسٹر

کا رشتہ لے کر آ گئے، صاحبزادے لندن سے کوئی میم تو ساتھ نہیں لائے تھے، مگر والدین سے مطالبہ تھا کہ لڑکی بالکل میم جیسی ہو ــــ اتفاق سے اُن کے والد بھی اُس دعوت میں شریک تھے، جہاں کاظم نے عابدہ کو اُس ڈرامائی انداز میں اپنے اکلوتے لڑکے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اور اس ذرا سے واقعہ نے، انتہائی رنگین افسانہ بن کر، عابدہ کو قلوپطرہ بنا دیا تھا۔ بیگم خالد نے اس رشتہ پر غور کرنے کی مہلت مانگی ــــــ اور عابدہ یہ سوچ کر پاگل ہو گئی کہ اُس کی شفیق ماں بھی اُس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش نہیں کر رہی ہے، گویا اُس کی نگاہ میں بھی اُس کی بیٹی کا کنوارا دل غالب کا وہ جام ہے جو

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا،

وہ اپنی انہیں تصورات کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ اُس کی ذرا سی آنکھ لگ گئی، اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ سرخ جوڑے میں، خوب بجی سجائی، دلہن بنی، حجلۂ عروسی میں، آہٹ پہ کان، در پہ نگہ کئے، ہاشم کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ اچانک اُسے سانپ نے کاٹ لیا ــــ چیخ کر اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کی ماں بھاگ کر آئی، دیکھا کہ وہ بالکل پسینہ سے تر ہے، اُس نے وجہ پوچھی، وہ بولی " مجھے کئی روز سے چکر، اور متلی کی تکلیف ہے، اور ہر وقت دل دھڑکتا رہتا ہے " ــــ ماں نے اُس وقت اُس کو نیبو کا شربت پلا کر لٹا دیا ــــ دوسرے دن سے اُس کی متلی نے شدت سے قے کی شکل اختیار کر لی، غذا تو پہلے ہی ترک تھی، اب پانی بھی ٹھہرنا مشکل ہو گیا، نقاہت بڑھنے لگی، ماں گھبرائی، سمجھی کسی نے اُس کی بھلی چنگی بچی پر کوئی جادو وغیرہ کر دیا ہے ــــ خالد نے اُس کو سمجھایا کہ یہ کسی مرض کے آثار ہیں، اور شہر سے حکیم بلانے کی تجویز پیش کی، عابدہ نے ماں سے اصرار کیا کہ باپ کو حکیم بلانے سے روک دے ــــ

اور یہ کہتے ہوئے، وہ ایک دم ماں سے لپٹ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، ماں گھبرا گئی، اُس کو اپنے سینے سے لپٹا لیا، اُس کی اب گھگھی بندھ گئی، ماں نے اُس کو تسلی دی، اور اُس کی بے قراری کی وجہ پوچھی — عابدہ نظریں نیچی کرکے، انتہائی خجالت سے، سسکیوں میں بولی "گذشتہ مہینہ بڑے دن کی تعطیل میں، جب ہاشم یہاں چند دنوں کے لئے، شکار کے سلسلہ میں آئے تھے، تو آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ تمھاری زندگی کا رفیق ہے، اس کی تواضع میں کوئی کوتاہی نہ ہونے دینا، میری بدنصیبی کہ میں منگیتر اور شوہر کے فرق کا لحاظ رکھنے میں چوک گئی، ان کی ہر فرمائش کی تعمیل کی، اور اپنی زندگی لٹا بیٹھی — خیر، یہ زندگی تو تولہ بھر سنکھیا سے ختم ہو جائے گی، البتہ ماں باپ کی عزت کو یوں خاک میں ملانے کا غم قبر میں بھی مجھے چین نہیں لینے دے گا ....

......" اب تو ماں کے پیر تلے سے یک بہ یک زمین نکل گئی، وہ بھاگی ہوئی بدحواس خالد کے پاس گئی، ساری رُوداد سنائی، اور کہا غلطی سراسر میری ہے، میں نے ہی عابدہ کو ہاشم کی تواضع پر تعینات کیا تھا، اور اُن کے آزادانہ میل ملاپ پر، یہ سوچ کر کہ، یہ تھوڑا سا ابتدائی میل جول، اُن کی مستقل رفاقت کے لئے بڑا خوش گوار ثابت ہوگا، میں نے عمداً چشم پوشی کی، نادان بچی اپنی سادہ لوحی میں ماری گئی — اُس نے خالد کو تاکید کی کہ ہاشم کی ماں سے مل کر اب اس گتھی کو فوراً سلجھانے کی کوشش کرے — خالد نے اُس کو تسلی دی "تم گھبراؤ نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھو، میں ابھی زندہ ہوں، نہ تم بیوہ ہو، نہ عابدہ یتیم ہے، تم دونوں کے سر پر ابھی چادر ہے" — خالد ہاشم کی ماں کے پاس اک شان بے نیازی سے گیا، اور اُن سے کہا "بہن! بیٹی تو والدین کے لئے پرایا دھن ہے، ایک روز اُس کو کسی دوسرے کے گھر رخصت کرنا ہی پڑتا ہے —

مگر بیٹے کی منگیتر کا ڈولا، بیٹے کی زندگی میں، دوسرے کے گھر جاتے ہوئے خوددار خاندان نہیں دیکھا کرتے، یا تو لے جانے والے کا سر اُتار لیتے ہیں، یا اپنا اُتروا دیتے ہیں، مگر آج اس کوٹھی میں وہ سر نہیں ہے جو عابدہ کا ڈولا اُٹھانے والے کا سر اُتار لے، یا خود اپنا سر اُتروا دے — آپ عورت ہیں، اور بیوہ ہیں، مگر اب بھی ایسی بیوائیں زندہ ہیں جو اپنے مرحوم شوہروں کی آن پر آنچ آنے سے قبل اپنی جان دے دیتی ہیں، بہرکیف، میں آج آپ کو اس وقت کاظم مرحوم کے صرف وہ الفاظ یاد دلانے آیا ہوں، جو اُنھوں نے عابدہ کو اپنی گود میں بٹھا کر کہے تھے، تاکہ آپ کو بعد میں یہ شکایت نہ ہو کہ مجھے اس کی خبر نہ ہوئی" — پھر خالد نے، اپنے الفاظ میں، دس بارہ سال قبل کے، اُس دعوت کے واقعہ کی، جس میں کاظم نے، عابدہ کو بھری محفل میں، "گلاب محل" کی زینت بنایا تھا، ایسی دلآویز منظر کشی کی کہ بیگم کاظم کی آنکھوں کے سامنے مرحوم کی منھ بولتی تصویر گھوم گئی — ابھی دس مہینہ پرانا زخم تھا، زخم کے سارے ٹانکے ٹوٹ گئے، وہ دفعتاً سسکیاں بھرنے لگیں — اور ابھی وہ اپنے اوپر قابو نہیں پانے پائی تھیں کہ خالد نے تڑسے اُن کی دُکھتی رگ پہ اُنگلی رکھ دی "مجھے آپ خوب جانتی ہیں، میں اللہ پہ توکل زندگی بسر کرنے کا عادی ہوں، آج تک صرف اپنا کھویا ہے، کسی کا کبھی کچھ لیا نہیں، مگر میں آپ کو اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ جن کو آپ اپنا محافظ سمجھ رہی ہیں وہ آپ کی کوٹھی میں، بڑی ہوشیاری سے نقب لگا رہے ہیں — آپ کے والدین ابھی زندہ ہیں، آپ کی دونوں بہنیاں آپ کے بھائی کے لڑکوں سے بیاہی ہوئی ہیں، بہ ظاہر تو یہ لوگ کاظم کی جائیداد آپ کے نام منتقل کرا رہے ہیں، مگر دراصل اُن کی اسکیم یہ ہے کہ، آپ کے مرنے کے بعد، آپ کا اکلوتا بیٹا آپ کے بھائیوں، اور

آپ کے بھتیجے دامادوں کے نرغے میں آجائے، اور آپ کی ساری جائیداد کی
تکا بوٹی ہو جائے ۔۔۔ گویا یہ آپ کی عالی شان کوٹھی ہندوستان، پاکستان،
بنگلادیش، آزاد کشمیر، اور مقبوضہ کشمیر بن جائے ۔۔۔ مانیں، نہ مانیں،
آپ کو اختیار ہے، میں نیک و بد آپ کو سمجھائے دیتا ہوں، غور کرلیجئے، اور
مجھے دو چار روز میں اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیجئے، مجھ پر بھی عابدہ کے رشتہ کے لئے
میرے سسرالی عزیزوں کا بڑا دباؤ ہے، میں دیر تک اُن کو ٹال نہیں سکتا۔۔۔"
ابھی خالد کی گفتگو جاری ہی تھی کہ ہاشم، اچانک اپنے کمرہ سے نکل کر وہاں آگیا،
وہ شاید یہ ساری گفتگو سُن رہا تھا، اُس کو دیکھتے ہی خالد ایک دم وہاں سے
یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ "مجھے ان حالات میں یہاں آنا نہیں چاہیئے
تھا، مگر یہ دیکھ کر کہ عابدہ اپنی جان پہ کھیل گئی ہے، میں مجبوراً حاضر ہو گیا،
بس خدا حافظ!" ۔۔۔ خالد تو اس معاملہ کو خدا کی حفاظت میں دے کر
چلے گئے، مگر پُرانے شکاری کا تیر ایسے ٹھیک نشانہ پر بیٹھا تھا کہ ماں بیٹے
دونوں ایک ساتھ چیت ہوگئے ۔۔۔ ہاشم برجستہ ماں سے مخاطب ہوا
"امی! آپ ساری جائیداد خوشی سے اپنے نام کرالیں، مجھے صرف عابدہ، اور
آپ کی دعا چاہیئے، آپ بھی خوش، میں بھی خوش، میرے مرحوم باپ کی روح
بھی خوش، میرا ننھیال بھی خوش، اس سے اچھا فیصلہ کیا ہوگا" ۔۔۔ ماں
فوراً اُٹھیں، بیٹے کو سینے سے لگالیا، بولیں "بیٹے! میں واقعی دھوکہ میں تھی،
خالد نے میری آنکھیں کھول دیں، تمہاری خوشی پر یہ ساری دولت نچھاور ہے،
ہونے بیٹیاں بھتیجوں کو دے دیں، وہی بہت ہے، تمہارے لئے جو تمہارے
باپ نے فیصلہ کیا ہے وہی ہوگا" ۔۔۔ وہ اُسی وقت خالد کے ہاں گئیں،
اور دوسرے ہفتہ عابدہ بیگم "گلاب محل" میں آگئیں ۔۔۔ بڑا مزا

اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر ـــــ شب عروسی کی ساری رنگینیاں شکوے شکایات کے دم سے ہی قائم ہیں، جہاں یہ حقیقی نہیں ہوتیں، وہاں موقع کی مناسبت سے کچھ مصنوعی بنالی جاتی ہیں ـــــ عموماً جتنی لانبی منگنی کی مدت ہوتی ہے، اتنی ہی طویل اُس کی داستان غم واشتیاق ـــ اور یہاں تو برس، دو برس نہیں، پورے دس بارہ برس کی داستان تھی، اور پھر آخری چھ ہفتوں کی جاں گُسل قہرسامانیاں، رات ختم ہوگئی، بات ختم نہ ہوئی، اُٹھتے اُٹھتے ہاشم کو مقطع میں وہ جان دینے والی بات یاد آگئی، اُس نے عابدہ کو چھیڑا "آپ نے یہ زہرِ عشق والا نسخہ آزمانے کی کیوں کوشش کی تھی، کیا آپ کو بھی کوئی بنارس بھیج رہا تھا" ـــــ وہ کھلکھلا کر ہنسی "میں کیوں سنکھیا، ونکھیا کھاتی، یہ تو کھائیں آپ کی خالہ زاد، اور ماموں زاد، جنھوں نے تمہارا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹتا دیکھکر باز کی طرح تم پر جھپٹنا شروع کر دیا تھا ـــ میں تو خدا کی دین پہ شاکر تھی، اور اُس سے ہی آس لگائے بیٹھی تھی ـــــ مگر جب دیکھا کہ محبت کی ڈینگیں مارنے والا، اب مکھی مار رہا ہے، تو میں نے مکھی کھانی شروع کر دی، اور چار روز میں، اللہ نے میری مشکل حل کر دی، اور میری منزل فتح ہوگئی۔ ـــــ کیا سمجھے؟ بے زبان لڑکیوں کے پاس بھی، اپنی محبت کی جنگ جیتنے کے لئے کچھ پُرانے قسم کے تیر بہ ہدف نسخے ہوتے ہیں!

دو کوڑی کی طوائف

راجہ صاحب بھیم پور قضا کر گئے، نوجوان کنور صاحب نے گدی سنبھالی، منی بائی کے دن بگڑ گئے، اُس کو محل میں عدت کے ایام بھی گذارنے کی اجازت نہیں ملی، مجبوراً وہ ایک چھوٹے سے کرایہ کے مکان میں منتقل ہو گئی، اُس نے نوعمر راجہ صاحب سے گذارہ الاؤنس کی درخواست کی، کوئی شنوائی نہیں ہوئی، تو اُس نے پچیس ہزار دین مہر کا نوٹس دیا، اُس کا جواب بھی نفی میں ملا، آخرش اُس نے سول کورٹ میں دعویٰ دائر کر دیا ــــ راجہ صاحب نے، اپنی ماں کی ہدایت پر، اس مطالبہ کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا، اُن کی طرف سے، اس مقدمہ کی پیروی کے لئے، وکیلوں کی ایک فوج ظفر موج کا بندوبست کیا گیا، حتیٰ کہ وہ پنشنر چیف جسٹس بھی، جنہوں نے، اپنی ملازمت کے زمانہ میں، رضوی سول جج کو، اس عہدہ پر فائز کیا تھا، خاص طور پر، چیف کاؤنسل کی حیثیت سے، اس مقدمہ میں بحث کے لئے، اخراجات کثیر پر، بلائے گئے سول جج کی مقامی عدالت میں، ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس کا پہلی بار، وکیل کی حیثیت سے پیش ہونا، بڑی غیر معمولی بات تھی، اور پھر ایک راجہ اور طوائف کا مقدمہ، جہاں حسن و عشق کی رنگیں داستان، بر سرِ اجلاس، سننے کا موقع تھا کیا بڑے، کیا چھوٹے، آج سب ہی احاطہ، عدالت میں ٹوٹ پڑے، کہیں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں

رہی، کمرۂ عدالت کی رونق بھی بس آج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، معلوم ہوتا تھا جیسے، چیف کاؤنسل، وکیل کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنے پرانے چیف جسٹس والے دبدبہ سے آرہے ہیں، ٹھیک دس بجے سول جج رضوی اپنی کرسیٔ عدالت پر آکر بیٹھ گئے، سامنے کے دروازہ سے راجہ صاحب، اپنے چیف کاؤنسل کی معیت میں، داخل ہوئے، اُن کے جلو میں، مقامی سربرآوردہ وکلا کی ایک لانبی قطار تھی۔ ـــــ اور آخر میں، ایک گم نام قسم کے، غیر مقامی وکیل کے پیچھے پیچھے منی بائی، سپید جارجٹ کی ساڑی میں آئی، چہرہ پر کوئی میک اپ نہیں تھا، پھر بھی وہ، سیاہ بالوں کو چھوڑ کر، سر سے پیر تک، دودھ جیسی سپید، ایک سنگ تراش کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی، وہ دوسری جانب، اپنے وکیل کی بغل میں، راجہ صاحب کے ٹھیک سامنے، گردن جھکا کر بیٹھ گئی ـــــ راجہ صاحب کے چیف کاؤنسل نے بحث شروع کی، بڑی دھواں دھار بحث تھی، ہر شخص گوش بر آواز تھا، وہ بار بار "یہ طوائف، یہ طوائف" کہہ کر منی بائی کی طرف اپنی انگلی اُٹھا کر اپنی بحث کے خاص پوائنٹوں پر زور دیتے، اور ہر بار اُن کی اُنگلی کے اشارہ پر مجمع کی نگاہیں اُس خاموش مجسمہ حسن کی طرف اُٹھ جاتیں، اور اس لفظ کی تکرار پر، ہر بار منی بائی کی آنکھوں سے، آنسو ٹپک پڑتے ـــــ چیف کاؤنسل نے اپنی بحث میں، نہایت معتبر شہادتوں کے حوالہ سے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ منی بائی ایک معمولی سی طوائف ہے، کسی تقریب میں، راجہ صاحب مرحوم کے ہاں آئی تھی، کوئی ایک ہفتہ مقیم رہی، راجہ صاحب مرحوم شوقین مزاج آدمی تھے، اس طوائف کی چڑھتی ہوئی جوانی تھی، اور اُن کا ڈھلتا ہوا شباب، وہ اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے، کچھ اُن کی طبیعت بھی شرعی تھی، اور زیادہ اس طوائف نے، اپنی عشوہ طرازیوں سے، اُن کو نکاح کرنے پر

مجبور کر دیا، اُنھوں نے کوئی معمولی سی رقم کے عوض نکاح کر لیا، اور غالباً وہ رقم مرحوم نے اس طوائف کو فوراً ادا کر دی۔ باقاعدہ کوئی نکاح نامہ پیش نہیں ہوا ہے، صرف ایک خط اکزبٹ A ہے، جس کو اس طوائف نے پیش بندی کے طور پر مرحوم سے حاصل کر لیا تھا، مگر اس خط میں بھی دین مہر کی کسی رقم کا کوئی تعین نہیں ہے، اس طوائف نے اپنے دعوے میں جن نکاح کے دو گواہوں کا ذکر کیا ہے، اُن میں سے ایک شہادت دینے سے قبل ہی مر گیا، اور دوسرا خود اس طوائف کا ایک بہت قریبی عزیز ہے، تا ہم گذشتہ سال حج پر گئے، سو وہ اب تک لاپتہ ہیں، شاید وہ وہاں قضائے عمری بخشوا رہے ہیں، ایسی صورت میں دین مہر کی رقم کا تعین خود عدالت کو ہی، اس دو کوڑی کی طوائف کی حیثیت کے مطابق کرنا ہوگا ——" اس دو کوڑی" کے فقرہ پہ منی بائی نے پہلی بار آنکھ اُٹھا کر عدالت کی طرف کچھ اس کرب سے دیکھا کہ اُس کی شعلہ بار آنکھوں کی چمک سے سارا مجمع مسحور ہو گیا، کچھ منچلوں نے، چیف کاؤنسل کے اس ریمارک پر "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کی خاموش طنز بھی کی۔ راجہ صاحب کے چیف کاؤنسل نے اپنی معرکتہ الآرا بحث ختم کی تو منی بائی کا وکیل جوابی بحث کے لئے کھڑا ہوا، معاً منی بائی کے ہونٹ تیزی سے کانپنے لگے، آنکھیں سرخ ہو گئیں، اور اس کے گلابی گالوں پر آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں، راجہ صاحب کے چیف کاؤنسل، جو کبھی سارے صوبہ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے، اُن کی مدد کے لئے تو درجنوں وکیل تھے، اور اُن کے جواب میں، منی بائی کی وکالت، ضلع غیر کا ایک معمولی وکیل کر رہا تھا، فریقین کے وکلا کے معیار کا یہ تضاد راجہ اور طوائف کی حیثیت میں فرق کا عبرت ناک ثبوت پیش کر رہا تھا، یہ احساس سارے مجمع کو تھا، اور شاید اُس وکیل کو بھی —— ایک نئے ضلع میں، ایک نئی عدالت میں، صوبہ کے

اعلیٰ ترین قانون دان کے مقابلہ میں، اتنے بڑے تعلقدار کے خلاف، دو کوڑی کی طوائف کی حق رسی کے لئے، اُس کی تائید میں بحث کرنا، کوئی معمولی بات نہیں تھی ــــ اُس نے ایک نگاہ مجمع پر ڈالی، پھر منی بائی کی طرف دیکھا، اور شاید یہ سوچ کر کہ آج منی بائی کے مقدمہ کے فیصلہ کے ساتھ اُس کی اپنی وکالت کے عروج و زوال کا بھی فیصلہ ہے، وہ عدالت کی طرف مؤدبانہ رجوع ہوا ــــ

حضور عالی! میرے دوست، میرے بھائی، بلکہ میرے بزرگ نے نہایت ہی مرصع و مسجع بحث کی ہے، مگر مجھے افسوس ہے کہ موصوف نے عدالت کا بیش قیمت وقت، اور اِس کبر سنی میں اپنی گراں قدر قوت، اِس طویل بحث میں، صرف کرکے، نہایت معتبر قسم کی شہادتوں کی تائید سے، صرف ایک ایسی چیز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا مجھے خود اقرار ہے، شہادت میں ایسے ایسے بزرگوں کو پیش کیا گیا ہے، جو مسلمہ طور پر بڑی قابل قدر اور باعزت ہستیاں ہیں، مثلاً ایک ریٹائرڈ کمشنر، جو اِس وقت ایک ریاست میں وزیراعظم کے عہدہ پر فائز ہیں، صرف یہ بیان دینے کے لئے، اتنی دور سے بلائے گئے کہ اُنہوں نے اپنے لڑکے کی شادی میں مرحوم راجہ صاحب بھیم پور کو مدعو کیا، مگر راجہ صاحب نے اُن کے دعوت نامہ کے جواب میں اُن کو لکھا کہ وہ جب تک منی بائی کو بھی اُن کے ساتھ مدعو نہیں کریں گے وہ اِس تقریب میں شریک نہیں ہوں گے ــــ ظاہر ہے راجہ صاحب مرحوم اِس ضلع کی سماجی زندگی میں ناک کی حیثیت رکھتے تھے، اِس تقریب میں اُن کی غیر حاضری بری طرح محسوس کی جاتی ــــ لہٰذا کمشنر صاحب نے اپنے زنان خانہ میں جا کر راجہ صاحب کے اِس جواب کا ذکر کیا، اور خواتین کی مرضی معلوم کی، اُن لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ اگر منی بائی آئیں تو وہ سب اِس تقریب سے اُٹھ جائیں گی چنانچہ

کمشنر صاحب مجبوراً راجہ صاحب مرحوم کو اُس تقریب میں نہیں بُلا سکے، اور اسی بنا پر اُن کی یہ تقریب بڑی پھیکی رہی ـــــ دوسرے ایک بہت سینیر، ریٹائرڈ مجسٹریٹ پیش ہوئے ہیں، اُن کا بیان ہے کہ جب وہ اس ضلع میں تعینات تھے تو کسی تحقیقات کے سلسلہ میں، سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ساتھ، اُن کو منی بائی کے علاقہ میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں اُن دونوں کو دو تین رات قیام کرنا پڑا، ایس۔پی، ایک غیر شادی شدہ انگریز تھا، وہ رسٹ ہاؤس کے دوسرے حصّہ میں ٹھہرا ہوا تھا، ایک صبح کو جب یہ اُس کے کمرہ میں اُس سے ملنے گئے، تو منی بائی نائٹ گون میں اُس کے پہلو میں بیٹھی چائے پی رہی تھی، وہ اُن کو دیکھکر فوراً ڈریسنگ روم میں چلی گئی ـــــ اسی نوعیت کی اور بھی کئی شہادتیں ہیں ـــــ مگر سوال یہ ہے کہ منی بائی کے طوائف ہونے سے مجھے کب انکار رہا ہے، البتہ اُس کو دو کوڑی کی طوائف کہنے پر ضرور اعتراض ہے، وہ خاص طور پر اس وجہ سے کہ میں مرحوم راجہ صاحب کو دو کوڑی کا رئیس نہیں سمجھتا ـــــ رہا، جہاں تک منی بائی کا طوائف ہونے کا سوال ہے، وہ بلا شبہ ایک پیشہ ور طوائف تھی، اُس نے اپنے حسن و شباب کی گراں قدر متاع کو، راجہ صاحب مرحوم کی خوشنودی کے لئے، کھلے بازار سے اُٹھا کر، صرف اُن کے لئے مخصوص کر دیا، اور اپنی مستقل ذریعہ آمدنی سے ہاتھ دھو لیا ـــــ منی بائی بھی طوائف کی حیثیت سے ایک عورت تھی، مگر اُس کا معاملہ راجہ صاحب کی والدہ سے بالکل مختلف تھا، اسی وجہ سے شاید مرحوم کی شاہانہ طبیعت کو مرغوب نہیں ہوئیں، اور اُنہوں نے اپنے کام و دہن کی لذت منی بائی کے لب و رخسار میں تلاش کی، اُس وقت منی بائی کا شباب عروج پر تھا، اُس کی قربت کے تمنائی روزانہ اُس کی ادنیٰ سی مسکراہٹ پر، چاندی کے سکوں سے، اُسکی

جھولی بھر رہے تھے، راجہ صاحب کی جوانی انحطاط پر تھی، ایسی صورت میں منی بائی اُن کی مردانی وجاہت پر تو نہیں مرمٹی ہوگی، یا تو اُس کو اِس پیشہ سے ہی نفرت ہوگئی تھی، یا پھر اُس نے دولت سے زیادہ اونچے سماجی مرتبہ کی خواہش میں، اپنا اتنا چمکتا ہوا آزاد کاروبار، یک لخت بند کر کے، راجہ صاحب مرحوم کی ٹھنڈی آغوش کو ہی گوارا پسند کیا — اُس کے نکاح سے ہمارے بزرگ دوست کو بھی انکار نہیں ہے، اعتراض صرف رقم کی زیادتی پر ہے — بڑی رانی کا دین مہر ایک لاکھ روپیہ ہے، جو عورت اُن کو راجہ صاحب مرحوم کے پہلے سے چھانٹ کر مستقلاً اُن کی سیج آباد کرے گی، اُس کی قیمت بھی تو اُسی کی مناسبت سے ہوگی، زیادہ نہیں، مساوی نہیں، نصف نہیں، تو کم از کم چوتھائی تو ہوگی، یا راجہ صاحب مرحوم اپنے بستر کی زینت کو اِس حال میں چھوڑ جائیں گے کہ وہ دوسرے غیروں کا پہلو گرم کر کے اپنا پیٹ پالے — پھر ایک مسلمان کے لئے، ہر وہ عورت، خواہ وہ دو کوڑی کی طوائف ہی کیوں نہ ہو، جس سے باپ نے ایک بار بھی جنسی تعلق پیدا کر لیا، وہ اُس کے بیٹے کے لئے ماں کا درجہ رکھتی ہے، رواجاً نہیں، شرعاً — ایسی مثالیں موجود ہیں، جہاں پر باپ کے مرنے کے بعد بیٹے نے، ایسی عورتوں کو جن سے باپ کے ناجائز تعلقات تھے اُن کو اپنے باپ کی بیوی تسلیم کر کے اُن کے ساتھ ماں ہی جیسا سلوک کیا، مجھے یقین ہے کہ یہ چیزیں عدالت کے علم میں ہیں، اس لئے میں اُن کا اعادہ یہاں کرنا ضروری نہیں سمجھتا — اِس مقدمہ میں نوجوان راجہ صاحب، اِس مطالبہ کو چیلنج کرنے میں، مطلوبہ رقم سے زائد، اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے، ضائع کر رہے ہیں، جبکہ منی بائی یہ رقم اُن کے مرحوم باپ کا وقار قائم رکھنے کے لئے طلب کر رہی ہے، تاکہ اُس کو اپنی گذر اوقات کے لئے پھر اپنے پرانے پیشہ کا سہارا لینے پر مجبور نہ ہونا پڑے،

اور اسی شہر میں اُس کے نئے گاہک "بھیم پور کی رانی" کا کوٹھا نہ دریافت کرتے پھریں ـــــ بحث ختم ہو گئی ـــــ پیشکار نے اعلان کیا کہ دوسرے روز سہ پہر کو فیصلہ سنایا جائے گا ـــــ ہر شخص منی بائی کے حسن، وقار اور تحمل سے بے حد متاثر تھا، اُس کی دلی خواہش تھی کہ وہ یہ مقدمہ جیت جائے، مگر حالات کے پیش نظر ہر شخص اُس کی کامیابی سے مایوس تھا ـــــ پھر بھی فیصلہ سننے کے لئے آج گزشتہ روز سے بھی بڑا مجمع اکٹھا تھا ـــــ مقدمہ کی سماعت کے دوران میں حاکم عدالت بالکل دم بخود رہا، معلوم نہیں اُس کا معمول ہی یہ تھا یا اسی مقدمہ میں اُس نے ایسا کیا، صرف اُس کی آنکھیں، اور کان کھلے تھے، اور کبھی کبھی کچھ نوٹ کرنے کے لئے اُس کے قلم کو جنبش ہوتی تھی، مگر زبان! وہ تو جیسے اُس کے منہ میں تھی ہی نہیں ـــــ سول جج نے وقت مقررہ پر اپنا آفس بکس کھولا، تجویز نکالی، وہ کافی لانبی تھی، مگر اُس نے کھلی عدالت میں، کسی وجہ سے، پوری نہیں سنائی ـــــ صرف ایک جملہ، رک رک کر، بلند آواز سے پڑھا: "جونیر (چھوٹی) رانی بھیم پور کا پچیس ہزار روپیہ کا دعویٰ، معہ اخراجات مقدمہ، منظور کیا جاتا ہے" ـــــ یہ کہہ کر جج اپنے چیمبر میں چلا گیا، مجمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا، منی بائی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، انتہائی غم، اور انتہائی خوشی، دونوں ہی کا اظہار، تو آنسوؤں کی طغیانی ہی سے ہوتا ہے ـــــ آج اس "دو کوڑی کی طوائف" کو بھیم پور میں اپنی زندگی کی معراج نصیب ہو گئی تھی، وہ تو اپنے گذارہ کے واسطے دین مہر کی رقم حاصل کرنے عدالت میں آئی تھی، اور وہاں حضرت موسیٰ والا معاملہ ہو گیا ؎

کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

خدا نے اُس کو عدالت سے بھیم پور کی رانی کا مصدقہ درجہ عطا کرا دیا ـــــ اُس نے محسوس کیا جیسے اُس کو ایک شہید فوجی جنرل کی بیوہ کی طرح بعد از موت تمغہ شجاعت

(POSTHUMOUS AWARD) ملا ہے ــــــ جج رضوی سے نوجوان راجہ صاحب کے بڑے گہرے تعلقات تھے، بھیم پور ہاؤس میں اُن کا برابر آنا جانا تھا، اُنہیں پر کیا منحصر، وہاں کے سارے حکام راجہ صاحب کے ہم نوالہ ہم پیالہ تھے ــــــ پھر بھی رضوی کی عدالت سے آج دو کوڑی کی طوائف اس شان سے مقدمہ جیت گئی، اس فیصلہ سے عدل جہانگیری کی یاد تازہ ہو گئی، منی بائی طوائف سے رانی بن گئی، اُس کو یہ مرتبہ بخشنے والے جج کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، عدالت کی توقیر بڑھ گئی، یہ وہ انصاف تھا جو صرف قانون کی نگاہ ہی میں نہیں، لوگوں کی نگاہ میں بھی انصاف معلوم ہوا، اور سب سے بڑھ کر اس فیصلہ نے راجہ صاحب کی خوابیدہ حس شرافت کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ــــــ وہ آگے بڑھے، اور اپنے مینجر کے ہاتھ سے، گلاب کے پھولوں کا وہ ہار، جو وہ راجہ صاحب کو پہنانے کے لئے لائے تھے، لے کر منی بائی کے گلے میں ڈال دیا، اور نہایت مؤدبانہ جھک کر اُن سے اپنی غلطی کی معافی مانگی، منی بائی نے بے تحاشہ اُن کو اپنے سینے سے لگا کر اُن کی پیشانی چوم لی ــــــ مجمع وہاں سے یہ کہتا ہوا چھٹ گیا کہ "شرافت کی یہی شان ہے، جج ہو تو ایسا، طوائف ہو تو ایسی، اور راجہ ہو تو ایسا!" ــــــ

حلالہ

نجمہ کرنل نقوی کی بڑی چہیتی بیٹی تھی، لڑکیاں تو یوں بھی باپ کو زیادہ عزیز ہوتی ہیں، مگر نجمہ کے ساتھ کرنل صاحب کے خاص التفات کی وجہ اُس کی کچھ خاص خوبیاں تھیں، اول تو وہ بے حد حسین تھی، سرخ سپید رنگ، چھریرا بدن، باپ جیسا لانبا قد، اور ایک عجیب دلآویز چال، اور اس کے ساتھ وہ پڑھنے کا شوق جیسے ماں کے پیٹ سے ہی لے کر آئی تھی، دس سال کی عمر پہنچتے پہنچتے وہ، اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو، تعلیمی میدان میں بہت پیچھے چھوڑ گئی، وہ دونوں ابھی انٹرنس اور انٹرمیڈیٹ کے مراحل ہی طے نہیں کر پائے تھے کہ نجمہ نے، انیس سال میں، بی اے کی سرحد پار کر کے یونیورسٹی میں، انگریزی ادب میں، ایم اے میں داخلہ لے لیا — اور وہاں پہنچ کر غیر نصابی سرگرمیوں میں جلد ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا، وہ پہلے ہی سال میں یونیورسٹی یونین کی سکریٹری منتخب ہو گئی، اور دوسرے الکشن میں صدارت کی کرسی پر جا بیٹھی — یہ دونوں الیکشن اُس نے جمعیت طلبہ کے ٹکٹ پر جیتا، اور دونوں بار یہ ٹکٹ اُس کو پروفیسر شاہد کی تحریک پر ملا — وہ پروفیسر شاہد کی طالبعلم نہیں تھی، مگر اُس کے علمی ذوق، اور خوبی کردار کے باعث پروفیسر شاہد کی نگاہ میں وہ اس ٹکٹ کی پوری طرح مستحق قرار پائی — نجمہ نے ایم اے کا امتحان طلائی تمغہ کے ساتھ پاس کر لیا، یونیورسٹی نے اُس کو اپنے ہاں لکچرار کی اسامی کی

پیش کش کی ۔ مگر اُس کے والد، فوجی افسر ہونے کے باوجود، لڑکیوں کی ملازمت کے خلاف تھے، اُن کے خیال میں عورت کی اصل جگہ اُس کا اپنا گھر ہے، ٹھیک اُسی طرح جیسے ایک سپاہی کا کام صرف اپنے ملک کا دفاع کرنا ہے، سیاست کے جھمیلوں میں پڑنا نہیں ـــــ عورت کو خود اپنی، اپنے بچوں کی، اور اپنے رفیق حیات کی زندگیوں کو پُر سکون طور پر گذارنے کے لئے، قانون قدرت کے تقسیم کار کے اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے، اُس کو گھر اور گھاٹ میں گھر کو منتخب کرنا چاہیئے، علم اُس کو اچھی بیوی، اور اچھی ماں بننے کے لئے حاصل کرنا چاہیئے، روٹی کمانا مرد کا کام ہے، الا بہ صورت مجبوری، مگر مرد یہ ذمہ داری، بغیر اچھی ماں، اور اچھی بیوی کے تعاون کے، بہ طریق احسن، ادا نہیں کر سکتا ـــــ نجمہ کی تربیت بچپن سے انہیں خیالات کے تحت ہوئی، اور اُس نے ان خیالات کو جبراً نہیں، عمداً قبول کر لیا تھا ـــــ اب اُس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہوتے ہی کرنل نقوی نے اُس کی شادی کی بابت سوچنا شروع کر دیا ـــــ کرنل صاحب آدمی تو پرانے خیال کے تھے، مگر پھر فوجی تھے، ایک حد سے زیادہ پرانے رسم و رواج کے پابند نہیں ہو سکتے تھے، وہ زمانہ کے ساتھ اندھے طور پر دوڑنا تو نہیں چاہتے تھے، لیکن وہ اِس کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ زمانہ اُن کو روندتا ہوا، اُن پر سے گذر جائے ـــــ اُنہوں نے عقیدہ، علاقہ، رنگ و نسل، سویلین، فوجی، کسی طرح کے نوجوان کے بابت اپنی ذاتی اظہار کئے بغیر، نجمہ کو اپنی پسند کا رفیق حیات منتخب کرنے کی اجازت دے دی، اُن کو اطمینان تھا کہ نجمہ، اپنی معقول تربیت اور اعلیٰ تعلیم کی مدد سے، اپنے لئے مناسب شریک زندگی کا انتخاب کر سکتی ہے ـــــ چنانچہ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اُس نے کیپٹن مشہود کو پسند کیا ـــــ مشہود کرنل نقوی کے ماتحت کام کر چکا تھا، اور

وہ اُس کے ذاتی اور خاندانی حالات سے اچھی طرح واقف تھے، اُس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی، مشہود کے خیالات، عام فوجی نوجوانوں کی طرح، مغرب زدہ ضرور تھے، مگر کرنل صاحب کے خود اپنے لڑکے بھی اُن کے ہم خیال سب تھے، وہ بھی تو لانبے بال، اور نیچی قلم رکھنے لگے تھے، اور فوجی ملازم نہ ہونے کے باوجود پابندی سے کلب کی تفریحات میں شرکت کرتے تھے ——
مشہود کی عام شہرت کرنل صاحب کے علم میں بالکل داغدار نہیں تھی، اُنہوں نے یہ رشتہ منظور کرلیا، اور نجمہ اپنی گھروالی ہو کر کرنل صاحب کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی —— وہ تو لڑکی تھی، پرایا دھن، اب تو لڑکے بھی، شادی کے بعد والدین کی آنکھوں سے اُسی طرح اوجھل ہو جاتے ہیں، اور جو آنکھوں کے سامنے رہتے بھی ہیں، اُن کے دلوں میں، والدین کا نقش بالکل معدوم ہو جاتا ہے —— مگر نجمہ اپنے گھر جاکر بھی والدین سے غافل نہیں ہوئی، وہ اکثر باپ کے ہاں آتی رہتی تھی، یہ چیز مشہود کو پسند نہیں تھی، کبھی کبھی اس بات پر دونوں میں اختلاف بھی ہوتا تھا مگر اُس کے والدین کو کبھی اس کی کوئی اطلاع نہیں ہوئی، نجمہ جب بھی آتی اپنے شوہر کی برابر تعریف کرتی، وہ لوگ اُس کی طرف سے بالکل مطمئن تھے ——
کرنل نقوی اب پنشن پر آگئے، اور مشہود فوج میں ترقی کے زینے تیزی کا سے طے کرنے لگا، نجمہ کی پُر مسرت ازدواجی زندگی کے پانچ سال پلک جھپکتے میں کٹ گئے —— ایک روز، بالکل اچانک، بغیر اطلاع، نجمہ اپنے خورد سال بچے کو لے کر، لٹی لٹائی شکل میں، باپ کے گھر میں داخل ہوئی، آج اُس کے ساتھ جو سامان تھا وہ اُس کی بے سروسامانی کی غمازی کر رہا تھا —— ماں باپ کا ماتھا ٹھنکا، اُنہوں نے دریافتِ حال کیا —— نجمہ نے 'صورت ببیں حالت مپرس' کہتے ہوئے باپ کے ضعیف ہاتھوں میں مشہود کا لکھا ہوا طلاق نامہ تھما دیا، وہ

اس وقت اس سے زیادہ والدین کو کچھ بتا نہیں سکی، اور نہ والدین کو مزید کچھ سننے کی تاب تھی، کچھ دنوں تک دونوں طرف بالکل خاموشی رہی ــــ نجمہ مشہود کو بھولنے کی کوشش کرتی رہی، اور والدین اس کے زخم کے مندمل ہونے کا انتظار کرتے رہے، اس طور پر دن پر دن، ہفتے پر ہفتے، مہینے پہ مہینے، گذرتے گئے، اور یوں ہی پورا سال گذر گیا، مگر نجمہ کے چہرہ پر شادابی نہیں لوٹی، ماں باپ کے اصرار پہ وہ کھا پی لیتی، گھوم پھر لیتی، مگر اس کا دل اندر سے بجھا رہتا ــــ پھر، ایک دن مشہود کا ایک بڑا طول طویل خط نجمہ کے نام موصول ہوا، اس میں اپنی بے انتہا شرمساری کا اظہار، بے پایاں محبت کا اقرار، اور اپنی بے حد بے چینی کا ذکر، بڑے رقت آمیز طور پہ کیا گیا تھا ــــ نجمہ نے وہ خط پڑھ کر کرنل صاحب کو دے دیا، کرنل صاحب نے اس کو غور سے پڑھا ــــ کہا بیٹی! فارسی کا قول ہے کہ "مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بہ کلۂ خود باید زد ــــ اب کیا ہو سکتا ہے؟ طلاق، طلاق ہے، بچوں کا کھیل نہیں، مٹی کا ایک گھروندا بنایا، کچھ دیر اس سے کھیلا، پھر آپس میں لڑ پڑے، ٹھوکر ماردی، وہ ٹوٹ گیا، تھوڑی دیر کے بعد من گئے، ان ٹکڑوں کو پھر اکٹھا کیا، اور وہ گھروندا، دوبارہ بن کر، بدستور تیار ہو گیا ــــ انسانی زندگی کے معاملات مٹی کے گھروندا نہیں ہیں، وہاں یہ کھیل نہیں کھیلا جا سکتا ــــ نجمہ خاموش ہو گئی ــــ پھر دوسرا خط آیا، پھر تیسرا خط آیا، پھر چوتھا خط آیا، سب کے جواب میں نجمہ کی طرف سے خاموشی رہی ــــ تو ایک روز فون آیا، اتفاق سے نجمہ ہی نے اسے اٹھایا۔

ــــ "ہلو! کون صاحب ہیں؟" ــــ "میں ہوں، تمھارا مشہود!" ــــ

اور پھر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا، دونوں کے ہاتھوں میں رسیور تھے، اور گفتگو کے بجائے گریہ کا تبادلہ ہو رہا تھا ــــ نجمہ کی نفرت کی دیوار

یک بہ یک، برف کے تودے کی طرح، پگھل کر بیٹھ گئی ـــ مشہود کرنل صاحب کے پاس حاضر ہوا، اپنی غلطی کی بے حد معافی مانگی، اور نجمہ سے اپنے ازدواجی تعلقات کے تجدید کی اجازت چاہی، اس نے کرنل صاحب کو یہ بھی بتایا کہ نجمہ اس کے لئے اب بالکل تیار ہے ـــ کرنل صاحب نے نجمہ سے گفتگو کی، معلوم ہوا کہ وہ تیار ہی نہیں، سخت بے چین ہے ـــ کرنل صاحب نے کہا یہ معاملہ شرعی ہے، اس سلسلہ میں وہ مفتی کی ہدایت پر ہی عمل کریں گے۔ مفتی شہر سے مشورہ کیا گیا، معلوم ہوا کہ تجدید تعلقات کے لئے حلالہ کے مرحلہ سے گذرنا ہوگا ـــ مشہود اس کے لئے فوراً راضی ہو گیا، نجمہ بھی آمادہ ہو گئی ـــ

مگر کرنل صاحب نے نجمہ کو سمجھایا کہ حلالہ کے مسئلہ پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ عام طور پر جذباتی انسان سمجھتے ہیں، حلالہ کی صورت میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اول تو یہ ضروری نہیں کہ جس شخص سے عقد ثانی کیا جائے وہ حسب توقع طلاق دے بھی دے، اس پر اس طرح کی کوئی شرعی اور قانونی شرط عائد نہیں ہو سکتی ـــ وہ طلاق دے بھی دے تو شوہر اول سے دوبارہ نکاح کرنے میں آئندہ زندگی بڑی مشتبہ اور بدمزہ بسر ہونے کا قوی احتمال ہے، جو مرد جذبات سے مغلوب ہو کر ایک بار طلاق دے سکتا ہے، اور پھر جذبات سے مغلوب ہو کر، اسی عورت سے، حلالہ جیسی ناپسند چیز گوارا کر کے، دوبارہ نکاح کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے، کیا وہ اسی جذباتی انداز میں، دوبارہ نکاح کے بعد، یہ نہیں سوچ سکتا کہ عارضی اس عورت نے اس دوسرے مرد کے لئے، اپنے دل میں مستقل طور پر ایک جگہ نہ پیدا کر لی ہو ـــ ظاہر ہے اس دوسرے مرد نے تھوڑے دن کے تعلقات کے دوران میں، ایک مہمان کے طور پر، غیر معمولی محبت، پیار اور حسن سلوک کا

برتاؤ کیا ہوگا، اُس کی زندگی کا صرف بہتر ہی رُخ اُس کی یادداشت میں محفوظ ہوگا، انسان کی کمزوریاں تو طویل تعلقات کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہیں، حلالہ میں اس کا کوئی موقع نہیں ہوتا — یہ طلاق کسی بددلی، بدمزگی سے نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو عورت کی خوشی کے لئے، اُس کی خواہش پر، ایک ایسے مرد کے لئے اُس کا راستہ صاف کیا جاتا ہے جو اُس کو ایک بار ٹھکرا چکا ہے۔ — علاوہ اس کے اس صورت میں یہ بھی خطرہ ہے کہ دوسرے شوہر سے تعلقات کے نتیجہ میں کوئی نطفہ قرار پا جائے — تو غریب عورت، پہلے شوہر، دوسرے شوہر، پہلے شوہر کے بچے، دوسرے شوہر کے بچے، پھر پہلے شوہر کے مزید بچوں کی متضاد محبتوں میں دن رات تڑپتی رہے —

کرنل صاحب نے نجمہ کو یہ تمام باتیں اچھی طرح سمجھا کر اس کو مشورہ دیا کہ اگر وہ شادی کرنا چاہتی ہے تو ضرور کرے، مگر وہ شادی، باقاعدہ شادی ہو، شادی کا ڈھکوسلہ نہ ہو — اُس کا علم، اُس کی صورت شکل، اُس کی عمر ابھی ایسی ہے کہ اُس کو اچھے سے اچھا رشتہ آسانی سے مل سکتا ہے — مگر نجمہ تو مشہود کی ہی زوجیت میں جانے کے لئے بالکل بے قرار تھی، وہ کبھی اپنی، کبھی اپنے بچہ کی زندگی کی بربادی کا واسطہ دے کر باپ کو اس امر پر راضی کرنے کی کوشش کرتی — مشہود کی جانب سے روز بروز اصرار بڑھتا جا رہا تھا، وہ بار بار نجمہ کو اور کرنل صاحب کو یقین دلاتا کہ اُس کو نجمہ کے حلالہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اور اگر اس کارروائی کے نتیجہ میں اُس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو گیا تو وہ اُسے بھی بڑی خوشی سے اپنا لے گا — اُس کی سمجھ میں

اس وقت یہ نہیں آ رہا تھا کہ بیوہ، مطلقہ اور حلالہ والی عورت میں زمین آسمان کا فرق ہے، مردہ شوہر کو صبر کیا جا سکتا ہے، طلاق دینے والے شوہر کو نفرت کے ساتھ

بھلایا جاسکتا ہے، مگر حلالہ والے شوہر کے خلاف حقیقی جذبہ پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ کرنل صاحب مشہود کو تو قائل نہیں کر سکے مگر حلالہ کے سلسلے میں جو دقتیں پیش آسکتی تھیں وہ کرنل صاحب نجمہ کو مختلف زاویوں سے دن رات سمجھا رہے تھے۔ مگر اب تو نجمہ مشہود کی بری طرح دیوانی ہو رہی تھی۔ کرنل صاحب نے اس سلسلہ میں ایک نئے زائد ماہر نفسیات کی بھی امداد لی کہ اُس کے ذہن سے یہ خیال نکالا جاسکے ـــــ مگر اس بارے میں اُن کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں ـــــ مشہود کرنل صاحب کی غیر موجودگی میں اُن کے مکان پر آکر دو چار بار نجمہ سے ملا بھی، ایک بار اُس کو اپنے ساتھ باہر لے جانے کی بھی کوشش کی، وہ تیار بھی ہوگئی، مگر آخر وقت میں ماں نے اُس کو کرنل صاحب کی اجازت کے بغیر جانے سے روک دیا ـــــ کرنل صاحب نجمہ کی بڑھتی ہوئی بدحواسی سے گھبرا کر مختلف مفتیوں کے دروازے پر دستک دیتے پھرے، مگر ہر جگہ وہی حلالہ کا حکم ملا ـــــ ایک روز نجمہ نے کرنل صاحب سے پروفیسر شاہد کا ذکر کیا ـــــ بتایا کہ وہ اسلامی تاریخ کے پروفیسر ہیں، خیالات اور اعمال دونوں لحاظ سے بڑے پکے مسلمان ہیں، اُن کی دیانت اور امانت کی یونیورسٹی میں قسم کھائی جاتی ہے، اُن کے اوپر اُن کے کنبہ کا بڑا بار ہے، اسی لئے انہوں نے اب تک شادی نہیں کی، بہت سی لڑکیوں نے محض اُن سے شادی کرنے کی غرض سے اُن کے ڈپارٹمنٹ میں داخلہ لیا، اور دن رات اُن کے گرد منڈلاتی رہیں، کچھ نے اُن کی خانگی ذمہ داریوں میں مالی طور پر ہاتھ بٹانے کی کوشش بھی کی، یہاں تک کہ اُن کے سیاسی مسلک کے سربراہ نے خود اپنی لڑکی کو اُن کے نکاح میں دینے کی پیش کش کی، مگر اُنہوں نے اپنے اصول کے تحت اُن میں سے کوئی بھی رشتہ قبول نہیں کیا ـــــ یونیورسٹی میں لڑکیوں کو اُن سے یہ عام شکایت ہے کہ مدرس تو وہ بہت اچھے ہیں،

مگر بے حد سرد مہر ہیں ـــــ لیکن میرا خیال ہے کہ، اگر میں اس مسئلہ میں اپنی پریشانی بیان کر کے اُن سے مدد طلب کروں گی تو غالباً وہ مجھے مایوس نہیں کریں گے، یوں بھی اب اُن کی شادی کی عمر ختم ہو رہی ہے، لہٰذا اُن سے طلاق کے معاملہ میں بھی کسی وعدہ خلافی کا کوئی خطرہ نہیں ہے ـــــ کرنل صاحب نے محسوس کیا کہ نجمہ کی بے تابی اب ہوش و خرد کی حد پار کر گئی ہے، اور وہ کسی وقت بھی اب شرعی اور اخلاقی دیوار کو مسمار کر کے قعرِ معصیت میں غرق آب ہوا چاہتی ہے ـــــ اُنہوں نے، بادلِ ناخواستہ پروفیسر شاہد سے حلالہ کرنے کی اجازت دے دی ـــــ نجمہ اور مشہود پروفیسر شاہد کی خدمت میں حاضر ہوئے، نہایت دردانگیز طور پر، اپنی اپنی وارفتگی کی رُوداد سنائی، اور آخر میں حرفِ مدعا، بڑی التجا کے ساتھ، زبان پر لائے ـــــ پروفیسر شاہد نے عذر کیا کہ میں نے اپنے حالات کے تحت، اصلی شادی کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دیا ہے، اس لئے یہ نقلی شادی رچا کر میں اپنی زندگی میں ایک نیا روگ نہیں لگانا چاہتا ـــــ البتہ اُنہوں نے اس سلسلہ میں کچھ متبادل نام پیش کئے، اور اُن کی ضمانت دینے کا بھی یقین دلایا، مگر وہ سب مقابلتہً کم عمر لوگ تھے، اِس لئے نجمہ اور مشہود اُن میں سے کسی پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے ـــــ نجمہ نے آخری حربہ کے طور پر اپنے بچہ کو پروفیسر شاہد کی گود میں ڈال دیا، اور اشک بار آنکھوں سے اُن کو مخاطب کیا "خدا کے لئے آپ اس معصوم بچہ پہ رحم کریں، تھوڑا سا ایثار کر کے اِس کو اس کا باپ واپس دلا دیں، میں ساری عمر آپ کی احسان مند رہوں گی . . . . . " ـــــ پروفیسر شاہد خاموش ہو گئے، ـــــ نجمہ نے میدان مار لیا ـــــ یہ دونوں خوش خوش کرنل نقوی کے

پاس واپس آئے، اور اُن کو اپنی کامیابی کی نوید سنائی، کرنل صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے —— دوسرے دن نجمہ کا عقد ثانی، نہایت خاموشی سے، پروفیسر شاہد سے ہو گیا —— پروگرام یہ طے ہوا کہ یہ دونوں ایک ہفتہ مری میں کسی ہوٹل میں گذاریں گے، اور پھر نجمہ پروفیسر شاہد سے طلاق نامہ لے کر واپس آجائے گی —— مقررہ روز نجمہ مری سے واپس آگئی، اسٹیشن پر اُس کو لینے کے لئے کرنل صاحب اور مشہود دونوں موجود تھے —— نجمہ ٹرین سے اُتری، مشہود کو نظر انداز کر کے، سیدھی کرنل صاحب کے پاس گئی" —— "پاپا! آپ نے صحیح کہا تھا، آزمودہ را آزمودن جہل است، میں آپ کی عزت سے بار بار نہیں کھیلنا چاہتی، مجھے اب کوئی طلاق نہیں لینی ہے، جس فرشتہ صفت کو کنواریاں نہیں حاصل کر سکیں، میں ایک مطلقہ اُس کو حاصل کر کے کھو دوں! —— بس اللہ نے اب مجھ کو جو دے دیا ہے میں اُس سے بالکل مطمئن ہوں۔ ۔ ۔ ۔" یہ سب کچھ نجمہ ایک سانس میں باپ سے کہہ گئی —— اور کرنل صاحب نے ایک دم اُس کو اپنے سینے سے اس طرح چمٹا لیا جیسے مرغی اپنے چوزوں کو چیل کی جھپٹ سے بچانے کے لئے اپنے پروں میں ڈھانپ لیتی ہے، اُن کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے —— مشہود یہ منظر دیکھ کر، بوجھل قدموں، اپنی اُجڑی ہوئی دنیا میں واپس چلا گیا ——

بہت دیر کی مہرباں...''

اکرم کا باپ پرائمری اسکول میں مدرس تھا، ایک لڑکا، دو لڑکیاں، خود میاں بیوی، پانچ آدمیوں کا کنبہ، روکھی سوکھی میں، صبر و شکر سے گذر کر رہا تھا ــــ یہ پرانی ریت ہے کہ کلرک سے کلرک، اور مدرس سے مدرس ہی پیدا ہوتا ہے، اس کے آگے نہ ان کا حوصلہ ہوتا، اور نہ ارباب اقتدار کی جانب سے ان کی حوصلہ افزائی ــــ مگر اکرم کو اللہ نے صورت کے ساتھ ساتھ ذہن بھی اچھا دے دیا، اُس کے باپ کو اُسے انگریزی اسکول میں مدرس بنانے کا شوق ہوا، اُس نے اپنا پیٹ کاٹ کر اکرم کو کالج میں داخل کر دیا ــــ اکرم نے چار سال میں، اچھے نمبروں سے، بی، اے پاس کرلیا ــــ اُس زمانہ میں تعلیمی ادارے نیشنلائز نہیں ہوئے تھے، غریب ہونہار نوجوانوں کو، اپنی استعداد کے مطابق، کم و بیش مشاہرہ پر، وہاں نوکری آسانی سے مل جاتی تھی، پڑھے لکھے بے روزگاروں کے لئے یہی واحد پناہ گاہ تھی ــــ اکرم بھی ایک ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ماسٹر لگ گیا، تھوڑی سی معاشی فراغت نصیب ہوئی، اب اُس نے، سخت محنت کر کے، انگریزی ادب میں ایم، اے کرلیا ــــ بے چاری ماں کے لئے یہ خوشی شادیٔ مرگ بن گئی، اور وہ بیٹے کے سر پر سہرے کے پھول کھلتے دیکھنے کی آرزو لے کر چل بسی،

مرتے وقت وہ اکرم کو ایک بڑا سرکاری افسر بننے کی دعا دے گئی، اُس زمانہ میں سرکاری ملازمت کا بول بالا تھا، عزت، وقار، رعب، پائیداری، یہ سب وہاں بدرجہ اتم موجود تھی، البتہ مالی منفعت ضرور کم تھی، مگر مال کی بھی تو اصل غرض حصول عزت و سکون زندگی ہی ہے، اور یہ چیز چھوٹی سے چھوٹی سرکاری ملازمت میں بھی، دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں، زیادہ تھی ـــــ مگر عام آدمی کے لئے، سرکاری ملازمت کا ملنا بڑا دشوار مسئلہ تھا، صرف پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ، کچھ مخصوص ملازمتوں میں ان کا انتخاب ممکن تھا ـــ وہاں اکرم کو کامیابی نہیں ہوئی تو اُس نے کسی بڑے تعلیمی ادارے میں ملازمت کی کوشش کی ـــ اتفاق سے قریب ہی ضلع میں ایک ہائی اسکول میں وہ ہیڈ ماسٹر کی جگہ پر منتخب ہو گیا۔ یہ اسکول کافی بڑا تھا، اور وہ اُس بڑی جگہ کے لئے بہت کم عمر تھا، تعلیمی قابلیت تو خیر ٹھیک تھی، مگر عملی تجربہ صرف دو سال کا تھا، لیکن انتظامیہ کے مینجر کو شاید اُس میں کوئی خاص بات نظر آئی، اُس نے اکرم کو زیادہ تجربہ کار اُمیدواروں پر ترجیح دے کر منتخب کر لیا، اُس کو اسٹارٹ بھی غیر معمولی طور پر زیادہ دیا، اراکین انتظامیہ کو اس امتیازی سلوک کی وجہ یہ بتائی کہ وہ انگریزی ادب میں، سکنڈ کلاس، ایم اے ہے، جو بہت کم یاب ہیں ـــــ اسکول بہت اچھا تھا، اراکین انتظامیہ بھی معقول تھے، اور مینجر صاحب، جو اصل کرتا دھرتا تھے، بے حد خلیق انسان تھے، وکالت تو اُن کا پیشہ تھا، مگر ادب و شاعری کا بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور بڑی بات یہ کہ، دیگر پرائیویٹ اداروں کے مینجروں کے برعکس، وہ اسکول فنڈ سے خود کبھی کسی طور پر مستفید نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہر موقع پر اسکول اور وہاں کے

طلبا اور مدرسین کی اعانت، اپنی جیب خاص سے کرنے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے تھے ـــــ اکرم کے ساتھ وہاں اُس کے متعلقین نہیں تھے، لہٰذا انھوں نے اکرم کو قیام کے لئے اپنے مہمان خانہ میں ہی جگہ دے دی، اور یہی نہیں، بلکہ کھانے پر بھی اپنے ساتھ ہی مجبور کیا ـــــ اکرم نے بچپن سے تنگی ترشی میں زندگی بسر کی تھی، مگر کسی کی روٹی آج تک کبھی نہیں کھائی تھی، لیکن منیجر صاحب کے اصرار کے آگے اُس کی کچھ پیش نہیں گئی ـــــ احسانات وقت کے ساتھ بھول جاتے ہیں! بعض اوقات مصلحتاً وقت کے وقت ہی بھلا دیئے جاتے ہیں، مگر احسانات جاریہ کو بھلانا تو مشکل ہے، وہ بھی جب وہ بہ ظاہر بے غرض ہوں ـــــ پھر بھی اکرم دن رات اسی اُدھیڑ بن میں رہتا کہ اُن کی کیا خدمت کرکے ان کا حق نمک ادا کرے، کوئی صورت اُس کی سمجھ میں نہ آتی ـــــ اُن کی صرف دو لڑکیاں تھیں، اُن دونوں کی انٹرنس تک کی تعلیم مقامی گرلز اسکول میں ہو چکی تھی، بڑی کی انٹرنس پاس کرتے ہی شادی ہو گئی، دوسری کو، پردہ کی پابندی کی وجہ سے، کالج جانے کی اجازت نہیں ملی، مگر انجم نے باپ کا علمی ذوق پایا تھا، وہ اُس کی آبیاری، اپنے طور پر، مکان ہی پر، کر رہی تھی، اکرم نے اُس کے ذوق کی ادبی کتابیں اسکول لائبریری سے چھانٹ کر اُس کو بھیجنا شروع کر دیں، اس سے زیادہ اُس کی بھی کوئی خدمت کرنے کا کوئی موقع اُس کو نظر نہ آیا، اسی دوران میں بڑے دن کی لانبی تعطیل ہوئی، وہ اپنے باپ سے ملنے اپنے گاؤں گیا، واپسی میں بیگم صاحبہ کے لئے دیہات کا عمدہ قسم کا گھی، تحفہ کے طور پر، لے آیا، وہ بہت خوش ہوئیں، مگر منیجر صاحب کے سخت اصول کے تحت، اُس کی قیمت ادا کئے بغیر، اُسے قبول کرنے پر راضی نہیں ہوئیں ـــــ اب اکرم کو ان لوگوں کے احسانات بے انتہا گراں معلوم ہونے لگے ـــــ اتفاق سے اُسی زمانہ میں منیجر صاحب کسی کام سے

ایک ہفتہ کے لئے کہیں باہر گئے، اکرم نے یہ موقع غنیمت جانا، اور اپنے اسکول کے ایک شادی شدہ اسٹنٹ ماسٹر کے ہاں پینگ گسٹ کے طور پر اپنے قیام و طعام کا انتظام کر لیا ــــ منیجر صاحب کی غیر حاضری میں، بیگم صاحبہ سے اجازت لے کر، وہاں سے منتقل ہونا چاہا ــــ مگر بیگم صاحب نے منیجر صاحب کی واپسی تک اس کی منتقلی روک دی ــــ جنوری کی سخت سردی کا موسم تھا، اندھیری رات تھی، گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی، ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، سردی خوب چمک گئی تھی، وہ آج معمول سے قبل، لیمپ گل کر کے، سونے جا رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، دروازہ کھولا تو ماما کھڑی تھی، بولی "اوپر آپ کو بٹیا بلا رہی ہیں" ــــ اکرم نے "اس اچانک طلبی پر" بوکھلا کر صرف اتنا پوچھا "ابھی؟" ــــ ماما نے کہا "ہاں" ــــ اور ہاتھ سے راہداری کی طرف اشارہ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی، وہ خاموشی سے ایک معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ــــ اوپر کمرہ میں انجم نے، انتہائی تپاک سے، اس کا خیر مقدم کیا، وہ اس اسم با مسمیٰ شکل کو دیکھ کر بالکل مسحور ہو گیا ــــ انجم نے، موسم کی شدت کے لحاظ سے، خود اپنے ہاتھ سے، فوراً ایک پیالی چائے بنا کر اس کو پیش کی ــــ اور نہایت سنجیدگی سے علمی اور ادبی موضوع پر اپنی گفتگو کا آغاز کیا ــــ خوش گوار ماحول میں کوئی ایک گھنٹہ تک یہ گفتگو جاری رہی ــــ اب اکرم نے اجازت مانگی، وہ اسے چھوڑنے کے لئے خود سیڑھیوں تک آئی، اور "شب بخیر، خدا حافظ" کہتے ہوئے ذرا رکی، اور پھر نگاہ نیچی کر کے، مسکرا کر کہا "صرف اس کمرہ سے جانے کی اجازت ہے، مکان سے نہیں!" ــــ

یہ تھی پہلی ملاقات، اور یہ تھا اس ملاقات کا آخری فقرہ! ــــ اکرم کو قدرت نے بڑی ہی متوازن طبیعت دی تھی، وہ جذبات میں کبھی نہیں بہکتا،

عاقبت اندیشی تو جیسے اُس کی گھٹی میں پڑی تھی، وہ نہ کبھی پریشانی سے دل شکستہ ہوتا، اور نہ خوشی سے بے قابو ـــــ مگر آج اُس کی زندگی کی یہ پہلی رات تھی کہ وہ بالکل نہیں سو سکا۔ صبح بڈّنی کے ساتھ ماما ایک پرزہ بھی لے آئی، اُس میں وہی رات والے فقرے کی تجدید تھی "صرف کمرہ سے جانے کی اجازت ہے، مکان سے نہیں، انجم!" ـــــ عورت تحریر کی افادیت سے خوب واقف ہوتی ہے، وہ جانتی ہے کہ زبانی الفاظ اکثر ایک کان سے داخل ہوکر دوسری جانب سے نکل جاتے ہیں، مگر تحریر کا ہر لفظ قاری کے ذہن پر مستقل نقش چھوڑ جاتا ہے، اسی لئے وہ اپنی تحریر میں، اپنا دل کھول کر رکھدیتی ہے، ـــ اور اس طور پر غریب اکثر ماری جاتی ہے ـــــ اکرم زندگی میں آج پہلی بار ذہنی اُلجھن میں پڑ گیا ـــــ منیجر صاحب نے واپس آکر اس کی منتقلی کی تجویز کو سرے سے ہی، اس بنا پر مسترد کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر کا اپنے کسی ماتحت کے ساتھ اس طرح پر قیام کرنا اسکول ڈسپلن کے خلاف اور خود اُس کے وقار کے منافی ہے ـــــ اکرم کی مشکل وقتی طور پر حل ہو گئی ـــــ باغبان بھی خوش، اور صیاد بھی راضی ـــ اب انجم سے پابندی سے خط و کتابت ہونے لگی، لگا ہے گاہے، حسب موقع، ملاقات بھی ہو جاتی، مختصر مگر بڑی ہی پُر لطف ـــــ لیکن زندگی کی رفاقت کا سوال، کسی ملاقات میں، حرفِ مطلب بن کر، اکرم کی زبان پر نہ آسکا ـــــ اسی دوران میں اکرم کی سرکاری ملازمت کی کوشش بار آور ہوئی، اور پبلک سروس کمیشن نے اُس کو ڈپٹی اسکول مدارس کی اسامی کے لئے منتخب کر لیا ـــــ اُس کا پروانہ تقرر آنا تھا کہ اُس کے چچا کو اپنی صاحبزادی کا بار ہلکا کرنے کا خیال پیدا ہو گیا، اُنھوں نے اکرم کے والد سے، اپنے خون کے رشتہ کا واسطہ دے کر، درخواست کی، والد نے ہامی بھرلی، بات پختہ ہو گئی ـــــ جنریشن گیپ کی ہوا ابھی نہیں چلی تھی،

اکرم نے باپ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیا — اسکول نے اکرم کو الوداعی پارٹی دی، مینجر صاحب نے بھی، اپنے طور پر، بڑے اہتمام کے ساتھ اُس کی دعوت کی — اس موقع پر انجم نے بھی اُس کو ایک تحفہ بھیجا، اُس میں ایک خط بھی تھا۔ "آپ کو شادی کی مسرتیں مبارک ہوں، مگر یاد رکھئے دل کا سودا بار بار نہیں ہوتا، وہ جسم کے سودے سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے، انشاء اللہ، ہم دونوں اپنی پاک دوستی ساری عمر نباہیں گے — آپ آئندہ مجھے اس طور پر خط لکھیں — ایک کاغذ کو دو پرتوں میں موڑ لیں، اوپر کے پرت پر والد صاحب کو مخاطب کریں، دوسرے پرت کو پانی میں تر کریں، اور خشک قلم سے، اُس پر مجھکو تحریر کریں، پھر اُس خط کو دھوپ میں خشک کر کے والد صاحب کے پتہ پر پوسٹ کر دیں، میں اُس کو پھر پانی میں تر کر کے آپ کی تحریر کو پڑھ لوں گی، اور آپ کے دفتر کے پتہ پر آپ کو برابر جواب لکھتی رہوں گی — اس طور پر آپ کی اور میری المکتوب نصف الملاقات ہوتی رہے گی"

— اب اکرم کی جگہ دوسرے ہیڈ ماسٹر کا انتخاب ہوا، مگر اب کی بار مینجر صاحب نے "اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے" کے اُصول پر عمل کیا، اور انجم کی شادی جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے طور پر ہو گئی — اس شادی میں اُنہوں نے اکرم کو بھی مدعو کیا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ شریک ہوا۔ مینجر صاحب نے اُس کو اور اُس کی بیوی کو تقریب کے ہر مرحلہ پر پیش پیش رکھا — تقریب کے اختتام پر، مینجر صاحب نے اکرم کو ایک ہفتہ تک مزید اپنے ہاں روک لیا، اسی درمیان میں انجم کا پردہ اکرم سے ٹوٹ گیا، اب ملاقات کے لئے رات کی قید نہیں رہی، دن میں کھلے عام یہ دونوں نو بیاہتا جوڑے آپس میں ملتے ملاتے رہے، اکرم انجم کے شوہر سے، اور اکرم کی بیوی انجم سے کافی کھل مل گئی۔

اب اکرم اور انجم کی خط و کتابت، طریقۂ خاص کے مطابق، برابر جاری رہی، بیس برس گذر گئے، دونوں کے گھر بچوں سے بھر گئے، مگر اُن کے جذبات کی حدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ـــــ البتہ اکرم کو کوئی چالیس سال کی عمر میں، اپنی زندگی کا، ایک نیا تجربہ ہوا ـــــ وہ تبدیل ہو کر ایک نئے ضلع میں آیا، وہاں ایک پرائمری اسکول کے مدرس کے خلاف بدچلنی کی رپورٹ بار بار آتی تھی، اور ہر بار اُس کا تبادلہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کے اسکول میں کر دیا جاتا تھا، دو چار مہینہ کے بعد پھر اُس کے خلاف وہی شکایت آتی، اور پھر تبادلہ کا چکر چلتا ـــــ دیہات کے پرائمری اسکولوں میں مدرس کے قیام کا انتظام اسکول کے منیجر ہی کے ذمہ تھا، وہ جس کے ہاں ٹھہرتا اُس کی بیوی، بہن، بیٹی یا بہو سے ناجائز تعلقات پیدا کر لیتا ـــــ اکرم نے اُس کی فائل دیکھی تو معلوم ہوا کہ گذشتہ پانچ سال میں اُس کے خلاف، اِس طرح کی بیس بائیس شکایتیں آ چکی ہیں، مگر بجز تبادلہ کے، اِس علت میں، کبھی اُس کی کوئی اور سزا نہیں ہوئی ـــــ اس کی وجہ یہ تھی کہ ظالم اتنا ہوشیار تھا کہ نچلے طبقے کی عورتوں کو چھوتا ہی نہ تھا، صرف بڑے گھرانوں کی عورتوں پر ہاتھ ڈالتا تھا، اور وہ لوگ، اپنی بدنامی کے ڈر سے، انکوائری کرانے پر، کسی طرح، راضی نہیں ہوتے تھے، اور بغیر انکوائری کے، تبادلہ کے علاوہ، اور کوئی سزا اُس کو دی نہیں جا سکتی تھی ـــــ اکرم کو خاصی پیچیدگی سے سابقہ ہوا ـــــ وہ طبعاً اس طرح کے افعال قبیح کو، خصوصاً تعلیم جیسے مقدس پیشہ میں، انتہائی بُری نظر سے دیکھتا تھا ـــــ اُس نے آخری رپورٹ پر، اُس مدرس کو، اپنے ہاں ذاتی پیشی کے لئے، طلب کر لیا ـــــ وہ دفتر میں حاضر ہوا تو اُسے اپنے بنگلہ پر بلایا، تاکہ وہ اُس سے اِس علت کی اصل وجہ

دریافت کرکے، اُس کے تدارک کی مناسب تدبیر سوچ سکے —— اکرم نے اُس کی کوئی فہمائش نہیں کی، بلکہ نہایت ملائمیت سے گفتگو شروع کی —— تمھارے خلاف اس قسم کی بیسیوں شکایات آچکی ہیں، ہر ڈپٹی انسپکٹر نے صرف تمھارا تبادلہ کرکے تم کو چھوڑ دیا، میں خود بھی، اِن شکایتوں پر تمھارے کم ازکم چار پانچ تبادلے کرچکا ہوں، اب تو میں دیکھتا ہوں کہ اس ضلع میں شاید ہی کوئی اسکول ایسا بچا ہو جہاں تم اس سے پہلے نہیں رہ چکے ہو، اب میں جہاں بھی تمھارا نام تجویز کرتا ہوں وہاں کا منیجر تمھارا نام سنتے ہی اپنے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتا ہے —— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اب تمھارے لئے کیا کروں، دیکھنے میں تم اچھے خاصے شریف آدمی معلوم ہوتے ہو، کام بھی تمھارا بہت اچھا ہے، بس تمھاری یہی ایک کمزوری سخت پریشان کن ہے —— پھر بھی میں تمھاری ملازمت نہیں لینا چاہتا، میں تم کو ایک اور موقع دینے کو تیار ہوں، بشرطیکہ تم مجھے سچ سچ یہ بتادو کہ آخر اتنے سارے، اچھے گھرانوں کی عورتوں کو، اتنی آسانی سے، کیسے اپنے دامِ فریب میں گرفتار کرلیتے ہو، —— پہلے اُس نے معذرت کی دد حضور یہ الزام غلط ہے!" —— اکرم نے اُس سے معلومات حاصل کرنے کی مزید کوشش پھر بھی جاری رکھی —— دیکھو میں بھی صورت شکل، قدوقامت، صحت وجسامت میں تم سے بُرا نہیں ہوں، تمھاری عمر میں، تم سے بہت بہتر تھا، مگر میری زندگی میں کبھی کوئی عورت اِس طور پر داخل نہیں ہوئی۔ اور تم جہاں جاتے ہو، ہزاروں پردوں میں، اپنے مذاق کی عورت فوراً تلاش کرلیتے ہو، اور وہ بھی بڑے گھرانوں میں —— اکرم کی یہ گفتگو سن کر جانے کیوں مدرس کو جواب دینے کا حوصلہ ہو گیا —— وہ بولا! حضور! نچلے طبقہ میں لڑکیوں کی شادی کم عمری ہی میں ہو جاتی ہے، بیوہ ہوئیں، یا طلاق ہوئی، تو وہ فوراً دوسرا گھر بسالیتی

ہیں، یوں بھی وہ دن رات سخت محنت کرتی رہتی ہیں، پھر اُن کے مردوں کے لئے جنس ہی واحد ذریعہ تفریح ہے ـــــ ایسی صورت میں اُن کو کبھی جنسی بھوک نہیں ستاتی، معاشی مجبوری سے البتہ وہ کبھی کبھی بک جاتی ہیں ـــــ مگر اونچے گھرانوں میں حالات بالکل برعکس ہیں، اُن کے ہاں ترغیب جنس کے اسباب کی تو کثرت ہے، اور تسکین کے بہت کم مواقع میسر آتے ہیں ـــــ اُن کی عورتوں کو فرصت ہی فرصت ہوتی ہے، خانہ داری کے کام سے بھی، اور تعداد اولاد سے بھی، بے کاری میں تفریحی مشاغل کی بھرمار ہوتی ہے، اُس پر جنسی لٹریچر کا دن رات مطالعہ سونے پر سہاگہ ـــــ دوسری طرف اُن کے مرد دولت اکٹھا کرنے کی جستجو میں دیوانے رہتے ہیں، اور پھر اس دولت کو وہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست، کے مقولہ کے مطابق، اپنی عیش پرستی میں خرچ کرتے رہتے ہیں، اور اُسی دولت سے اپنی بیویوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ دولت کی فراوانی جنس کی اشتہا کو بڑھاتی ہے، گھٹاتی نہیں ـــــ اُن کے گھر میں زائد عمر کی کنواریاں، اور کم عمر کی بیوائیں، اُن کی جھوٹی خاندانی وجاہت اور روایت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ کر، گیلی لکڑی کی طرح، خاموش سلگتی رہتی ہیں ـــــ ان عورتوں کو حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، صرف موقع ملنے کی دیر ہوتی ہے، بس ذرا سی جرأت سے کام لے کر سے

جو بڑھ کر خود اُٹھالے جام و مینا بس اُسی کا ہے

میں ایسی حالت میں بے دھڑک پیش قدمی کر بیٹھتا ہوں، اور آج تک کبھی ناکام نہیں ہوا ـــــ البتہ جو مرد بدنامی کے خوف سے، ایسے موقعوں پر پس و پیش سے کام لیتے ہیں، وہ انتہائی قریب آ کر بھی، ساری عمر دور ہی دور سے ایک دوسرے

کی پرستش کر کے دل کو بہلاتے اور جلاتے رہتے ہیں ـــــ اس طور پہ بزدل مرد خود بھی مایوس ہوتا ہے، اور فریقِ ثانی کو بھی مایوس کرتا ہے ـــــ مدرس کی اس گفتگو نے اکرم کے دماغ میں عجیب ہلچل پیدا کر دی ـــــ اُس نے اُس مدرس کو مدرسی کی جگہ سے ہٹا کر اپنے دفتر میں بطور کلرک تبدیل کر دیا، تاکہ اب وہ ہر وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے رہے ـــــ وہ آدمی تو با صلاحیت تھا ہی، اُس نے جلد ہی اپنے کام اور اپنے سلوک سے سارے دفتر کو خوش کر لیا، وہ اکثر اپنا کام نپٹا کر دوسروں کا کام بھی کر دیتا، دفتر ہی کا نہیں، بعض اوقات گھر کا بھی ـــــ ایک روز اکرم نے اُس کو اپنی سیٹ پہ نہیں دیکھا، سوچا، کیا کسی شکار کی تلاش میں پھر کہیں باہر نکل گیا! فوراً ہیڈ کلرک کو بلایا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اُن کی لیڈی اسسٹنٹ انسپکٹرس نے، خاص طور پہ سفارش کر کے، اُس کو اپنے پرسنل کلرک کی جگہ تعینات کرا لیا ہے ـــــ یہ سن کر اکرم بالکل دم بخود رہ گیا ـــــ رات کو جب وہ لیٹا تو اس واقعہ کے مضمرات پہ غور کرنے لگا ـــــ اور پھر اُس کو اپنی پُرانی سرگذشت ایک عجیب معمہ معلوم ہونے لگی ـــــ دوسرے روز اُس نے انجم کو اُس مدرس کی پوری داستان لکھ دی ـــــ جواب آیا ـــــ

"افسوس! ـــــ وہ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

بانجھ کون

برصغیر کی تقسیم ہوتے ہی، سارے ہندوستان میں، قتل و غارت گری کی وبا پھوٹ پڑی، ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلمان پاکستان ہجرت کرنے لگے، زیادہ تر کا رُخ مغرب کی طرف تھا، شاید اس رُخ پر پنج وقتہ نماز پڑھنے کی وجہ سے وہ اسی جانب اپنی پناہ گاہ ڈھونڈ رہے تھے، یا ان کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ آخر شِ ستم کو یہیں پناہ نصیب ہے ــــ مگر اس طرف خشکی کا راستہ جلد ہی کٹ گیا، مجبوراً لوگ بمبئی سے، پانی کے جہاز کے ذریعہ، مغربی پاکستان میں داخل ہونے لگے، بمبئی میں مہاجروں کی اتنی بھیڑ ہو گئی کہ ہفتوں جہاز کا ٹکٹ ملنا دشوار ہو گیا، ایسی صورت میں وہاں بہت سے خاندان آپس میں مل کر ایک یونٹ بنا لیتے، یا از خود بن جاتے ــــ ایسا ہی ایک یونٹ لکھنؤ کے تین خاندانوں کا بن گیا ــــ حلیم، منور، اور شاہد ــــ شاہد تو، اپنے دم سے، بالکل اکیلا تھا، ماں باپ، قضائے الٰہی سے، وہیں فوت ہو گئے تھے، تینوں بیاہی بہنیں ہندوستان میں ہی رہ گئی تھیں ــــ منور کا میاں، بیوی اور بیٹی کا ایک مختصر سا کنبہ تھا۔ البتہ حلیم کے پریوار کی تعداد کافی تھی ــــ یہ تینوں گھرانے کراچی پہنچ کر ایک سرکاری بلڈنگ میں پناہ گزین ہوئے، اور ایک عرصہ تک، یہاں پر ایک مشترکہ خاندان کی طرح گھل مل کر رہے ــــ ابتلا کی صورت میں اکثر لوگ متحد ہو جاتے ہیں، جو

نہیں ہوتے وہ دربدر ٹھوکریں کھاتے ہیں، یہ لوگ اپنا سب کچھ کھو کر یہاں از سرِ نو آباد ہونے کے لئے آئے تھے، اس لئے یہ لوگ ایک مٹھی کی شکل میں گتھ کر اپنی آبادکاری کی جدوجہد میں لگ گئے۔ شاہد یہاں علی گڑھ کی الیکشن ٹیم کے ساتھ دوبار آچکا تھا، یونیورسٹی کا سمجھا ہوا مقرر تھا، اور بڑا خوش گلو بھی، بہتوں کو اپنا گرویدہ بنا گیا تھا، وہ آنے کے ساتھ ہی ایک کالج میں لیکچرر لگ گیا، اور جلد ہی دو شفٹوں میں کام کرنے لگا۔ منور نے بھی تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مقامی وکیل کی چیمبر میں، اپنی وکالت شروع کر دی۔ البتہ حلیم کے یہاں معاشی سوال کافی پریشان کن تھا، وہ اپنے وقت کے اچھے قسم کے صحافی، ادیب، اور رنگین مزاج شاعر تھے ۔۔۔ مگر اب بقول غالب ۔۔۔ ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اُن کو عشق سے زیادہ، عمر نے نکما کر دیا تھا ۔۔۔ پھر بھی گرگ باراں دیدہ تھے، ابھی ذہن فعال تھا، ہاتھ پیروں کا کام بھی وہ اپنے دماغ سے لینے لگے، اس سلسلہ میں اُن کی بیوی اُن کے بہت کام آئیں، غالباً وہ دوسری بیوی تھیں، بہت چاق و چوبند، خاصی پڑھی لکھی، وہ خواتین کی ایک سماجی انجمن میں شریک ہو گئیں، لڑکے تو اُن کے کئی تھے، مگر بدقسمتی سے ہونہار کوئی نہیں تھا، ایک ممتاز صورت شکل کا خاصا وجیہ تھا، علم تو باپ کا سا نہیں حاصل کر سکا، مگر ملنے ملانے کے مجلسی آداب، اور لوگوں کو شیشے میں اُتارنے کا ڈھب خود سیکھ گیا تھا ۔۔۔ ماں باپ کی سفارش سے اُس کو ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی، وہاں اُس نے، اپنی عملی کارکردگی سے، جلد اپنا سکہ جما لیا، تنخواہ میں معقول اضافہ ہو گیا، اور کار بھی مل گئی۔ طبیعت کے منچلے تھے، کار ملتے ہی، کاروالی کی ضرورت محسوس کرنے لگے ۔۔۔ اسی دوران میں منور کی بیوی کا اچانک انتقال ہو گیا، عذرا کے سر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا، منور نے اُس کی دیکھ بھال حلیم کی بیوی کے سپرد کر دی، حلیم کی اکلوتی بیٹی پروین اور عذرا میں بمبئی سے ہی بہناپا چل رہا تھا ۔۔۔ پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا،

ہر وقت ساتھ ساتھ تھا ــــ ممتاز اُس کے حسن، اُس کے سلیقہ، اُس کے مہر، اُس کے علمی ذوق، اور سب سے زیادہ اُس کی شوخیِ طبع کے دو سال سے گرویدہ ہو رہے تھے، مگر اپنی اور اپنے کنبہ کی بے بضاعتی کے باعث اظہارِ مدعا کی جرأت نہیں کر رہے تھے ــــ لیکن ادھر ان کی حالت سدھری، اور اُدھر عذرا کی ماں کو موت نے لپک لیا، اور خود ان کی ماں اُس کی سرپرست ہوگئیں، اس سے زیادہ اچھا موقع اُس گوہرِ نامدار کو حاصل کرنے کا اور کیا ہو سکتا تھا، انہوں نے جھٹ اپنی ماں کے ذریعہ انور کے پاس، اور پروین کے ذریعہ عذرا کے پاس، سلسلہ جنبانی شروع کردی ــــ مگر دونوں طرف سے اُس کی پذیرائی بڑی سرد مہری سے ہوئی ــــ انور کو کاروباری دنیا کے ان کارندوں کی طرزِ زندگی پسند نہیں تھی، اور وہ عذرا کی نگاہ میں ممتاز کے بجائے شاہد کے لئے پسندیدگی کا احساس کر رہا تھا ــــ علاوہ اس کے ممتاز کا معاملہ ایک انار و صد بیمار کا تھا، ضعیف ماں باپ، ایک کنواری، زیرِ تعلیم بہن، کئی ایک بے روزگار بھائی ــــ حلیم کی خود کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی، یوں ہی کبھی کسی مشاعرے، یا مضمون سے کچھ مل جاتا تھا، اخراجات کے معاملہ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا، لہٰذا اُن کے ہاں برابر تنگی رہتی تھی، جس کو معمولاً شاہد دور کرتے رہتے تھے ــــ ایسی صورت میں حلیم اور ان کی بیوی، اور خود پروین، اس ذریعہ کو اپنے کنبہ کے لئے مستقل بنانے کی غرض سے شاہد کو پروین سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی برابر کوشش کر رہے تھے، مگر شاہد راضی نہیں ہوتا تھا، وہ لوگ جب اس مسئلہ پر بند الفاظ میں اُس سے اصرار کرتے تو وہ اُن کی مالی امداد میں مزید اضافہ کر دیتا کہ وہ خاموش ہو جائیں، مگر اس کی یہ تدبیر الٹا اثر کرتی، اُن لوگوں کو شاہد کو اپنانے کا اشتیاق اور بڑھ جاتا ــــ عورتیں مردوں کی پسندیدگی کی نگاہ خوب پہچانتی ہیں، اور ایک عورت

دوسری عورت کے دل کا حال فوراً بھانپ لیتی ہے ــــ کچھ شاید پروین نے ماں کو سمجھایا، اور کچھ انہوں نے خود بھی بھانپ لیا کہ شاہد اور عذرا، خاموشی سے ایک دوسرے پر ریجھے ہوئے ہیں، مگر اظہار کسی طرف سے نہیں ہوتا تھا، منور تو ظاہر ہے خود پیش قدمی نہیں کر سکتے تھے، اور نہ عذرا کو اس کی اجازت دے سکتے تھے ـــ اور پھر منور کو حلیم کی جانب سے پروین کے لئے شاہد کو حاصل کرنے کی کوشش کا علم بھی تھا، ایسی صورت میں دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر تو نہیں لے سکتے تھے، تعلقات کا خیال نہ بھی ہوتا، تو بیوی کے مرجانے کی وجہ سے اُن کو اپنی مجبوری کا خیال تو تھا، تنہا کنواری لڑکی کو، اس افراتفری کے دور میں، نے کر وہ کہاں جاتے ـــ حلیم اور اُن کی بیوی نے شاہد کو پروین کے لئے حاصل کرنے کے لئے پہلے عذرا کو اُس کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی، اور انور پر عذرا کا رشتہ ممتاز سے کرنے کے لیے سخت دباؤ ڈالنا شروع کر دیا، دن رات، صبح شام، اُٹھتے بیٹھتے، انور کے سامنے یہی سوال مختلف طریقہ سے پیش کرتے رہتے، مجبوراً انور نے ہامی بھرلی، اور عذرا ممتاز کے حجلۂ عروسی کی زینت بن گئی، جلد ہی ممتاز کی کمپنی نے اُس کو ڈھاکہ تبدیل کر دیا، اس طرح عذرا کی شادی کے ابتدائی چند سال قدرے سکون سے کٹ گئے ـــ مگر ایک روز، کسی علت میں، یکبارگی ممتاز کی وہ ملازمت چھوٹ گئی، اُس کو کراچی آنا پڑا، اس بے روزگاری کے ایام میں انور نے اپنی بیٹی داماد کا سارا بوجھ خود اُٹھا لیا، مگر بڑا سوال تو ممتاز کے کنبہ کی بے سروسامانی کا تھا، اس موقع پر بھی شاہد ہی نے حلیم کے کنبہ کی دستگیری کی، مگر پروین سے شادی پر پھر بھی وہ راضی نہیں ہوا ــــ البتہ ممتاز کے روزگار کی تلاش میں بڑی جدوجہد کی، بارے ان سب کی کوششوں کے نتیجہ میں ممتاز کو ایک جہاز کی کمپنی میں دوبارہ ملازمت مل گئی، اور یہ ملازمت

پہلی والی سے بھی بہتر تھی، جلد ہی حالات سنبھل گئے ـــ شادی کو دس سال ہو چکے تھے، مگر عذرا کی گود ابھی تک ہری نہیں ہوئی تھی۔ اب معاشی فراغت نصیب ہوئی تو ممتاز کو اولاد کی کمی بڑی طرح محسوس ہونے لگی۔ قدرت کے بھی عجیب کھیل ہیں، آدمی کبھی کھانے کو تلاش کرتا ہے، اور کبھی کھانے والوں کو ـــ کمپنی میں علاج کی بڑی سہولت تھی، وہاں اُس نے عذرا کا کافی علاج کرایا، مگر لاحاصل، علاج کی کثرت سے اُس کی صحت، روز بہ روز گرنے لگی ـــ اسی درمیان میں وہ باپ کے سایہ سے بھی محروم ہوگئی ـــ اب اُس کا ستارہ بُری طرح گردش میں آگیا ـــ وہ ممتاز، اُس کے ماں باپ، بھائی بہن کی جتنی بھی خدمت کرتی وہ لوگ اُس سے اُتنا ہی زیادہ بےزاری کا اظہار کرتے، ممتاز کے علاوہ اب اُس کے باپ کو بھی بچہ نہ پیدا ہونے کی اُس سے شکایت ہوگئی، ممتاز کی ماں پروین کی تئیس سال سے زائد عمر ہو جانے کے باوجود شادی نہ ہونے کی ذمہ دار بھی عذرا ہی کو سمجھتی تھی، اُس کو یقین تھا کہ ممتاز سے عذرا کی شادی ہو جانے کی وجہ سے شاہد انتقاماً پروین سے شادی نہیں کر رہا ہے، حالانکہ شاہد اب بھی اُن لوگوں کی مالی امداد اُسی فراغ دستی سے کر رہا تھا، بلکہ اب پہلے سے بھی زیادہ ـــ ممتاز اکثر اپنی کمپنی کے کام سے ڈھاکہ اور چاٹگام جایا کرتا تھا، ایک بار ذرا لمبے وقفے کے لئے گیا تو معلوم ہوا کہ اُس نے وہاں اپنے باپ کے ایک پرانے دوست کی لڑکی سے دوسری شادی کرلی، عذرا کو اس خبر سے بہت رنج ہوا، مگر وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی، اُسے اپنی مجبوریوں کا احساس تھا، اُس نے عائلی قانون کا سہارا لینے کی بجائے ممتاز کے اس فیصلہ کو خاموشی سے قبول کرلیا ـــ اب کوثر کراچی آگئی، عذرا اُس کے ساتھ گذارا کرنے کے لئے تیار ہوگئی، مگر چند ہی ہفتوں کے بعد کوثر نے اُس کے ساتھ رہنے سے انکار کردیا،

مجبوراً ممتاز نے عذرا کی رہائش کا علیحدہ بندوبست کر دیا، یہ انتظام بھی ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا ——— اور پھر وہ دن آ گیا جس کا خوف عذرا کو کوثر کے آنے کے روز ہی ہو گیا تھا ——— ممتاز نے، کوثر کے مطالبہ پر، عذرا سے گلو خلاصی کی تحریک کی، اور طلاق کی شرائط پر گفتگو کا آغاز کیا ——— اس موقع پر شاہد کو بھی خاص طور پر بلا لیا گیا تھا ——— عذرا نے ممتاز کو جواب دیا کہ اس مہاجرت میں پہلے ماں نے ساتھ چھوڑا، پھر باپ منہ موڑ گیا، بھائی کوئی پیدا ہی نہیں ہوا، اولاد اللہ نے دی ہی نہیں، ایک شوہر کا سہارا تھا، اس سے آج آپ، اپنی زندگی ہی میں، مجھے محروم کرنا چاہتے ہیں، میں طلاق نہیں چاہتی، میں مشرقی ماحول کی پروردہ ہوں، باپ نے جس کے ہاتھ میں ہاتھ تھما دیا اُسی کے قدموں میں زندگی گذار دینا چاہتی ہوں، پھر میں طلاق کی شرائط کیا پیش کروں ——— مگر ممتاز پر اس گفتگو کا کوئی اثر نہیں ہوا، اُس نے عذرا کو پہلے سے لکھا ہوا طلاق نامہ تھما دیا ———

عذرا گلوگیر آواز میں ممتاز کے والد سے مخاطب ہوئی "پندرہ سال قبل جس چاؤ سے مجھے اس گھر میں لایا گیا تھا، آج اتنی ہی بے اعتنائی سے مجھ پر اس گھر کا دروازہ بند کر دیا گیا، اور یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ میرا اب اس دنیا میں کون ہے، اور میں کہاں جاؤں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ———

شاہد ایک دم اُٹھا، اُس نے اپنے رومال سے اُس کے آنسو پونچھے، اور تسلی دی کہ ہمت نہ ہارو، خدا پر بھروسہ رکھو، وہ بڑا مسبب الاسباب ہے ———

عذرا نے اپنی عدت کے ایام اپنی کالج کی ایک پرانی سہیلی کے ہاں گذارنے کا فیصلہ کیا، اس درمیان میں شاہد اُس کے یہاں برابر جاتا رہا، وہ اس کی ضروریات دریافت کرتا، اور مالی پیش کش بھی کرتا، مگر اُس نے کبھی کچھ قبول

نہیں کیا ــــ وہ شاہد سے بس یہی اصرار کرتی کہ آپ مجھے کہیں کوئی ملازمت دلا دیجئے، شاہد ہمیشہ اس موضوع کو خوبصورتی سے ٹال جاتا ــــ "تم نے افسانے لکھ لکھ کر خود اپنی زندگی ہی افسانہ بنا لی، اب تم کو ملازمت کی کیا ضرورت ہے"ــ عدت ختم ہو گئی تو عذرا نے ملازمت کے لئے ایک روز شدت سے تقاضا کیا ــــ شاہد نے دبے ہوئے الفاظ میں پوچھا "عقد ثانی کی بابت کیا خیال ہے؟" ــــ

"مجھے اب دوسری شادی کسی حالت میں نہیں کرنی ہے" عذرا کا یہ دو ٹوک جواب تھا،

"مجھ سے بھی نہیں!" شاہد نے یکبارگی اپنی خواہش کا اظہار اس طور پہ کر دیا کہ عذرا بالکل مبہوت ہو گئی، اُسے معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پر پتھر دے مارا، ایک دم چونک کر آنکھیں پھاڑ کر بولی "کیا کہا!ــ آپ نے، یعنی خود آپ سے!"

"کیوں؟" شاہد نے پوچھا "اس میں کیا تعجب ہے؟" ــــ

"ہے کیوں نہیں، آپ کنوارے، میں پندرہ سال کی شادی شدہ، بانجھ، مطلقہ، بھلا کوئی جوڑ بھی ہے!" عذرا نے اپنے خیال کی وضاحت کی ــــ "یہی تو تمہاری اصل خوبی ہے" شاہد نے اپنا نقطہ نظر اس کو بتانا شروع کیا "اگر اس کی تصدیق پہلے ہو گئی ہوتی کہ تم بانجھ ہو تو میں تم کو کب کا اپنا چکا ہوتا، میں نے تمھاری کنواری آنکھوں میں محبت کا پیغام پندرہ سال پہلے ہی پڑھ لیا تھا، تمھارے والد کی خواہش کا بھی مجھے علم تھا، اور خود میرے دل میں بھی تمھارے لئے وہی جذبہ تھا، مگر یہی ایک رکاوٹ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ــ عذرا نے سوچا اللہ کی مصلحت انسان کی فہم سے بالاتر ہے، جو چیز ایک فرد کی نگاہ میں عیب ہے، وہی دوسرے کی نگاہ میں خوبی ہے ــــ خیر، عذرا کی شادی شاہد سے ہو گئی،

اور ان دونوں کی زندگیاں جنت کا نمونہ بن گئیں، اُن کی آپس میں چاہت کی اتنی شدت تھی کہ یہ جاننا دشوار تھا کہ کس کو کس پر فوقیت ہے، دوسروں کو ہی نہیں، اُن کو خود بھی ـــــ ایک روز عذرا نے شاہد سے بانجھ عورت کی خرابی کی وجہ دریافت کی ـــ شاہد نے اُس کو مختصراً بتایا کہ میرے ماں باپ کا ایک نہایت حسین جوڑا تھا، ان دونوں میں آپس میں بڑی گرویدگی تھی، دراصل یہ اُن کی آپس کی پسند کی شادی تھی، معاشی طور پر بھی فارغ البالی تھی، شادی کے ابتدائی دس سال میں پانچ بچے ہوئے، دو بیٹے، اور تین بیٹیاں، قضائے الٰہی سے بڑا لڑکا، دس سال کا ہو کر، اچانک ایک حادثہ میں، فوت ہو گیا ـــ وہ کیا مرا کہ میری ماں کے دل میں میرے باپ کے لئے پیار کا سوتا ہی یکبارگی خشک ہو گیا، اُنہوں نے تیس سال سے بھی کم عمر میں ازدواجی تعلقات بالکل ختم کر لئے، اور اپنی ساری توجہ کا مرکز صرف مجھے بنا لیا، اُن کے سارے التفات بس میرے لئے وقف ہو کر رہ گئے ـــ حتیٰ کہ وہ والد کو کھانا بھیجنے سے پہلے سالن کا کل روغن، اور دودھ کی پوری بالائی، میرے لئے اُتار لیتیں، وہ روز یہ دیکھتے تھے، مگر اُن کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آئی، نہ اُنہوں نے اپنی جانب سے، میری ماں کی خاطرداری میں کبھی کوئی کمی کی، یہ سلسلہ برسہا برس تک چلا، مگر میری ماں کے رویے میں، اُن کے واسطے کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی، جب کہ وہ اوروں کے لئے بالکل نارمل تھیں، وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں، صوم و صلوٰۃ کی بہت پابند، حج بھی کر آئی تھیں، مگر اس حادثہ کے بعد وہ شوہر کے حقوق کی پاسداری نہ کر سکیں، نتیجتہً میرے والد، ایک طویل، بے مزہ رہبانی زندگی گذار کر، ایک روز اپنا سب کچھ ہم دونوں کے لئے چھوڑ کر اچانک قضا کر گئے، تب میری ماں کو ہوش آیا، مگر اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت،

میری ابتدائی زندگی انہیں تلخ تجربات کے تحت گزری ہے ـــــ ماں کی حیثیت سے عورت کا تصور، میری نگاہ میں بہت بلند ہے، مگر ایک اچھی ماں اچھی بیوی بھی بن سکتی ہے یہ چیز، میرے خیال میں، اس حد تک اتفاقی ہے کہ یہ چانس وہی لوگ لے سکتے ہیں جو ایک سے زیادہ شادی کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں، یا اس معاملہ میں شرعی اور اخلاقی پابندی کے قائل نہ ہوں، میرے لئے ان دونوں صورتوں میں کوئی بھی ممکن نہ تھی، لہٰذا تیسری صورت صرف یہ تھی کہ میں ایک رفیقِ زندگی کی تلاش اس وقت تک جاری رکھوں جب تک تمھاری جیسی کوئی خاتون نہ مل جائے جو جملہ محاسن کے ساتھ ساتھ مصدقہ طور پر بانجھ بھی ہو ـــــ پھر شاہد نے، کسی اور موقع پر، اپنے اس نظریہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے عذرا کو بتایا کہ قدرت نے بنیادی طور پر عورت کو ماں بنایا ہے، بیوی کی حیثیت اس کی بالکل ضمنی ہے، شوہر سے اس کی دلچسپی، فطری تقاضے کے تحت، بچے کی پیدائش ہی کی غرض سے ہوتی ہے، اس کے بعد وہ اپنے اور اپنے بچوں کی معاشی اور سماجی تحفظ کے لئے شوہر سے محبت کی ریت نباہتی رہتی ہے، جس میں خلوص کم، اور مصلحت زیادہ ہوتی ہے، ہاں گرتی عمر میں اس کو شوہر کی یاد اس وقت ضرور آتی ہے جب بہو اس کے بیٹے پر قابض ہو جاتی ہے ـــــ ـــــ ان دونوں کی زندگی یک جان دو قالب کے طور پر، بڑی پر مسرت گزر رہی تھی کہ ایک دن عذرا نے اچانک محسوس کیا کہ جیسے وہ حاملہ ہے، اس کے ہوش اڑ گئے، وہ بھاگی ہوئی ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی، اس نے اس کے خیال کی تصدیق کردی، یہ سن کر وہ بالکل بدحواس ہوگئی، قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتی، لیڈی ڈاکٹر نے اس کو سنبھالا، وجہ پوچھی، عذرا نے اپنی پوری سرگذشت سنادی، اور اس سے بڑے ہی ملتجیانہ طور پر درخواست

کی کہ وہ اُس کا یہ حمل ضایع کرا دے، مگر لیڈی ڈاکٹر اس کے لیے تیار نہیں ہوئی،
اُس نے اُس کو سمجھایا کہ مانع حمل کی تدبیریں بہت آسان ہیں، مگر دفعیہ کی صورت
بڑی خطرناک ہے، اور قانون کے خلاف بھی ہے، وہ مایوس گھر لوٹ آئی۔
اُس کی راتوں کی نیند بالکل اُڑ گئی، وہ ہر وقت یہ سوچتی کہ یہ حمل بھی میرے
لئے کیا عذاب ہے، ایک بار بچہ نہ ہونے کی وجہ سے طلاق ملی، اب شاید
بچہ ہونے کی پاداشں میں یہ دن دوبارہ دیکھنا پڑے گا، خدا کی مصلحتیں تو
ناقابل فہم ہیں ہی، مگر اس ترقی یافتہ دور میں انسانوں کے فیصلے بھی کچھ کم
ناقابل فہم نہیں ہوتے، روزمرہ کی خانگی زندگی میں ذرا ذرا سے واقعات
اور حادثات کیسی کیسی نفسیاتی اُلجھنیں بچوں میں پیدا کر دیتے ہیں، جو اُن کی
ساری زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہیں ــــ وہ اسی ادھیڑ بُن میں
پریشان تھی کہ ایک روز اُس کو سخت اختلاج قلب کا دورہ پڑا، شاہد بھاگ کر
ڈاکٹر لائے، اُس نے غور سے معائنہ کیا، اور ہنس کر کہا " پریشانی کی کوئی
بات نہیں ہے، یہ حاملہ ہیں، اِن کو مکمل آرام کی ضرورت ہے، ذہنی اور
جسمانی دونوں، نیند کے لئے، حسب ضرورت، ویلیم کی گولی دے دی جائے"
ڈاکٹر عذرا کو گویا ایک گولی مار کر چلا گیا ــــ اور وہ زخمی ہرن کی طرح، بےبس،
اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے لئے، اپنے شکاری کو، پُرنم آنکھوں سے، تکنے
لگی ــــ تھوڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی رہی، ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے، پھر عذرا آہستہ سے بولی " اسقاط کرا دیجیے! " ــــ شاہد
اتنی دیر میں اپنے اوپر قابو پا چکا تھا، اُس نے عذرا کو تسلی دی " میرے
لئے تمھاری جان بڑی قیمتی ہے، میں اُس کو کبھی خطرہ میں نہیں ڈال سکتا،
اور نہ میں اپنے بچہ کا خون کر سکتا ہوں، میں اُس باپ کا بیٹا ہوں جس نے

کوئی تیس سال تک اپنے ارمانوں کا خون کر کے اپنے بیوی بچوں کے حقوق ادا کیئے ——— میرے لئے اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے، ممکن ہے بیوی کے معاملہ میں میری تقدیر میرے باپ سے مختلف ہو، تم فکر نہ کرو.. . . . ." اور عذرا کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو یکبارگی برس پڑے ——— ممتاز کے یہاں کوثر بھی اب بانجھ قرار پا چکی تھی، عذرا کے یہاں لڑکے کی ولادت کی خبر اُن کے یہاں گولا بن کر گری ——— اور اب ممتاز کے سارے عزیز و اقارب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا ———

"بانجھ کون ؟" ———

فرار

یہ مجمع، یہ چہل پہل، یہ شور، آج وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا، بالکل پہلی بار — قدم قدم پر وہ اس کو غور سے دیکھنے کے لئے رکتا، اور ماں اُس کا ہاتھ تھام کر بار بار آگے بڑھاتی کہ میلہ کی بھیڑ میں وہ کہیں کھو نہ جائے — مگر وہ تو آج اتنے سارے آدمی، دوکانیں، تماشے، روشنی، باجے، اور جانے کیا کیا دیکھنے میں بالکل کھویا ہوا تھا — ماں آج بچہ کے ساتھ کمبھ نہا کے بہت خوش تھی، بے انتہا خوش، وہ اپنے پچھلے مرے ہوئے بچوں کو اس وقت بالکل بھول سی گئی تھی، بلکہ اُن موتوں کو اب یاد کرتے ہوئے بھی وہ ڈرتی تھی، اُس نے سنا تھا کہ یہ باتیں یاد کرنے سے پھر پیش آجاتی ہیں، اور اب وہ اِن چھوتوں سے اتنا سہم گئی تھی کہ اس کے خیال سے ہی اُس کا دل لرز جاتا تھا — اُس کے من میں تو بس اب ہر وقت موہن بسا ہوا تھا، جیسے خود موہن کے دماغ میں آج میلے کے یہ دل آویز نقوش — موہن روز بہ روز تیزی سے بڑھ رہا تھا، اور ساوتری اپنے بچے کی اس اٹھان کو دیکھ کر گویا اپنا کھویا ہوا شباب پھر سے واپس پا رہی تھی — ماں کا دل دن رات بیٹے میں، اور بیٹے کا ماں میں تھا — مگر دماغ، وہ تو شاید موہن کمبھ کے میلے ہی میں چھوڑ آیا تھا — موہن گھر میں آیا، اور ماں اُسے دیکھ کر کھل گئی، اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے

خوش ہو گیا — مگر باہر جاتے ہی اُس کو یہ کھیت، یہ الاؤ، یہ باغ، یہ تالاب، یہ کھلیان جیسے اُسے کاٹنے دوڑتے — وہ ان کو سات آٹھ سال سے دیکھتے دیکھتے اب اوب گیا تھا — اُس نے اب جغرافیہ میں الہ آباد، کان پور، لکھنؤ کے نام بھی پڑھ لئے تھے، کان پور اُس کا اپنا ضلع، الہ آباد وہی کمبھ میلہ والا شہر، اور لکھنؤ، وہاں تو صوبہ کی راجدھانی ہے — بیل، گھوڑے، ہاتھی، اپنے دروازے پر بندھے اُس کو نہیں بھا رہے تھے، اُس کو تو اب وہ گاڑی یاد آ رہی تھی جس کی تیز روشنی سے اُس کو میلہ میں چکا چوند ہونے لگی تھی، اور اُس کی ماں نے جلدی سے اُس گاڑی کے سامنے سے اس کو کھینچ لیا تھا، ورنہ وہ تو دوڑ کر اُس میں چڑھ بھی جاتا — اب وہ رفتہ رفتہ اپنے باپ کے پاس زیادہ بیٹھنے لگا، اس کی اس تبدیلی سے باپ خوش، اور ماں متحیر تھی، وہ اب تیزی سے باپ سے مانوس ہو رہا تھا، وہ اب باپ سے ڈرتا کم، اور فرمائشیں زیادہ کرنے لگا تھا، کبھی کبھی اُس کے ساتھ اپنی پسند کی چیزیں خریدنے شہر بھی چلا جاتا — وہ اب اکثر شہر جانے کی منتیں مانا کرتا، جیسے کبھی اُس کی ماں خود اُس کی پیدائش کی منتیں مانتی تھی، اور جیسے وہ اب بھی اُس کی زندگی کی مانگ رہی تھی — شہر سے واپسی پر موہن ہر بار ایک نئی چوٹ مول لے کر آتا، وہی اپنی ماں جیسی چوٹ، ہر چوٹ پر شہر کی رونقیں اُس کو عزیز سے عزیز تر ہوتی جا رہی تھیں — ساوتری کی چوٹ کا علم تو جیت کو تھا، مگر موہن کی اس چوٹ کا علم، نہ ساوتری کو، نہ جیت کو، اور نہ شاید خود موہن کو بھی — مگر من میں جیسے ایک چھوٹی سی چنگاری پڑی ہوئی تھی، ایک دن وہ یکایک بھڑک اُٹھی — "ہم اب مڈل اسکول میں نہیں، انگریزی اسکول میں پڑھیں گے، پھول پور میں نہیں، کان پور شہر میں" موہن نے بارہ سال کی عمر میں اپنا یہ قطعی فیصلہ سنا دیا — اکلوتا لڑکا، پانچ کو

مار کر زندہ تھا، یوں بھی اُس میں چھ لڑکوں کی طاقت ہونی چاہیئے تھی، مگر اُس کے بعد پھر اور کوئی لڑکا پیدا ہی نہیں ہوا، ایسی صورت میں، اُس کی طاقت، اپنے گھر میں، صدر امریکہ سے کم کیا ہوتی، بلکہ شاید اُس سے بھی کچھ زیادہ، اُس کی جگہ پر کرنے والا نہ کوئی نایب تھا، اور نہ وقت کے وقت چپا جا سکتا تھا، — مجبوراً اجیت کو بیٹے سے ہار ماننی پڑی، پہلی ہار — ساوتری شوہر سے جدا رہ سکتی تھی، مگر موہن سے نہیں، بیٹے کو چھوڑنا تو کسی بھی عورت کے لئے مشکل ہے، پھر اکلوتے بیٹے کو، لہٰذا اُس کو بھی اپنی راجدھانی چھوڑ کر شہر آنا پڑا — اب موہن خوش تھا، بہت خوش، بے حد خوش، باپ سے، ماں سے، اور اپنے آپ سے — اب وہ خوب پڑھنے لگا، ماں باپ کا حوصلہ بھی اُس کی تعلیمی ترقی دیکھکر بڑھ گیا — شہر میں اخراجات ضرور زائد تھے، مگر وہ موہن کی خوشی اور آرام کی، اُن کی نگاہ میں، بڑی معمولی قیمت تھی، — موہن نے انٹرنس پاس کر لیا، زمیندار کا لڑکا، پہلے سال ہی میں اول درجہ میں انٹرنس پاس کرنا کوئی معمولی بات تھی، اور وہ بھی انگریزوں کے زمانہ کا انٹرنس، جسے پاس کر کے لوگ گورنمنٹ آف انڈیا میں حکومت کے سکریٹری بھی ہو جاتے تھے — کوئی نہیں کہہ سکتا آج اجیت کتنا خوش تھا، وہ شادی کی پہلی رات، اور پہلی اولاد کی پیدائش کی خوشی بھی آج بھول گیا — خود اُس نے کبھی کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا، بچے چھ ہوئے، بچا صرف ایک، مگر یہ امتحان، یہ تو نہ اُس نے پاس کیا تھا، اور نہ اُس کے باپ نے، بیٹے کا نام گزٹ میں چھپا تھا، ولدیت کے کالم میں اُس کا بھی نام تھا، گویا اُس کو خطاب مل گیا تھا، جس سے اُس کا سر اونچا، اور دل و دماغ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے — اور ساوتری اُس سے اپنا وچن پورا کرانے کی آرزو

ٹیباغ باغ ہو رہی تھی، موہن سولہ ہی سال کا ہے تو کیا، وہ اب اُس کی شادی فوراً کرے گی، خود اُس کے شوہر کی عمر بھی تو اُس کی شادی کے وقت یہی تھی، اُس کے گھر میں، تو برابر اسی عمر میں شادی ہوتی آئی ہے، وہ تو انٹرنس کے خیال سے پارسال رُک گئی، ورنہ وہ تو اُسی وقت کر دیتی، عمر اور جہیز یہ لڑکے کی بڑائی اور جہیز، موہن اچھا خاصا سیانا ہو گیا ہے، گھی دودھ پر پلا ہوا تندرست و توانا لڑکا اگر کہیں بہک گیا تو کیا ہوگا، یہ سب پڑھائی لکھائی دھری رہ جائے گی، کچی عمر کا بہکا ساری عمر بہکا رہتا ہے، پختہ عمر کی شادی شادی نہیں، کاروبار ہوتی ہے، شادی تو دراصل چڑھتی ہوئی جوانی کی چیز ہے، اس میدان میں فتح ماہروں کو نہیں، نوآموزوں کو حاصل ہوتی ہے —

— پھر اپنا گھر بھی تو سونا سونا ہے، موہن تو اب باہر کا ہو گیا، اپنی عمر گزر گئی، اجیت کو دھن اور موہن کے پوزیشن کی فکر ہے، اور ہم کو موہن کی بہو اور اُس کے بچے کی — ہم تو اپنے باغ کی بہار، گھر میں بیٹھے، اپنے بچوں ہی میں دیکھتے ہیں، ہم کو اب یہ گھر سونا سونا لگتا ہے، کاٹتا ہے، اجیت کو اب موہن کی شادی کرنی ہی ہوگی — مگر دولت، علم، پوزیشن، جس قدر ملتی ہے، اُس کی طلب اُتنی ہی بڑھتی جاتی ہے — اجیت ساوتری کو سمجھاتا اور پھسلاتا رہا، کبھی ہنس کر، کبھی روٹھ کر، کبھی خوشامد کر کے۔ ایک، دو، تین سال وہ کاٹ لے گیا — اب ساوتری بی، اے کی اُمید پہ جی رہی تھی، شہر میں آکر اُس نے بھی اب بہت سے بی، اے دیکھ لیے تھے، اُس کو اب بھی بہو کی خواہش بی، اے سے بہت زیادہ تھی، مگر اب وہ باپ کے جذبات کو سمجھنے لگی تھی، کچھ اُس کے سمجھانے سے، اور زیادہ خود موہن کے کہنے سے — شادی کے ذکر سے موہن کا چہرہ اُتر جاتا، اور اس کے التوا کی خبر سن کر وہ پھر ابھر سا جاتا،

ساوتری اس چیز کو غور کر رہی تھی، اور وہ اسی وجہ سے اپنے دل پر جبر کئے ہوئے تھی ـــــ اب موہن کالج میں، ہوسٹل میں، سینما میں، نمائش میں، اپنا دل بہلا رہا تھا، صرف دل ہی بہلا رہا تھا، دماغ اُس کا ابھی بے قابو نہیں ہوا تھا ـــ ماں کو اُس نے پیدائش سے پوجا پاٹ میں مستعد دیکھا، اب تو شہر میں آ کر وہ روز گنگا بھی نہانے لگی تھی، گھر میں اُس کے ہمیشہ امن رہا، اُس کے ماں باپ میں کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوئی، مگر وہ میل جول، جو وہ اور جوڑوں میں، اسٹیشن پر، سینما میں، کلب میں، ہوٹل میں، پارک میں دیکھتا تھا، وہ کبھی اپنے ماں باپ میں نہیں دیکھ سکا، پھر بھی وہ دونوں بہت خوش تھے، دل وجان سے خوش، اور اُن کی خوشی کا واحد مرکز صرف وہ تھا ـــــ مگر اب جیسے وہ اپنی اس حالت سے بھی اکتانے لگا ـــ وہاں ہزاروں لڑکے تھے، چھوٹے، بڑے، اتنے بڑے شہر میں وہ بالکل تنہا رہتے، پڑھتے، کھیلتے، اور گھومتے ـــ لڑکے ہی کیوں ـــ سیکڑوں لڑکیاں بھی، جو خود اس سے کہیں زیادہ آزاد تھیں ـــ اب اُس کو پھر اپنے گاؤں کے خشک ماحول کی تلخی کا بری طرح احساس ہونے لگا ـــ مگر اب وہ سمجھدار تھا، تعلیم یافتہ تھا، وہ اپنے ان جذبات کو ماں باپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ خود اُن پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا ـــ لیکن جذبات، وہ بھی چڑھتی ہوئی جوانی کے کہیں آسانی سے قابو میں آتے ہیں، وہ ارادی طور پر اُن کو دباتا تھا، اور وہ غیر ارادی طور پر اُس کو ـــ موہن کے دل و دماغ میں یہ کشمکش جاری تھی، ماں نے اُس کی اِس تبدیلی کو جلد بھانپ لیا، مگر وہ پریشان نہیں، خوش ہوئی، اب اُس کو یقین ہو گیا کہ خود موہن میں بھی شادی کی حس بیدار ہو گئی ہے، اب اُس نے اہمیت سے موہن کی شادی کا مطالبہ شدت سے شروع کر دیا، وہ بہلاوے دیتا رہا، مگر

مگر اُس نے ایک نہیں سُنی، بات پر بات آرہی تھی، اُن میں سے ایک اچھی سمی اُس نے طے کرلی، اور اجیت کو ہاں کرتے ہی بنی ـــ مگر شادی کے لئے بی۔ اے کے امتحان کی قید لگادی گئی، ـــ خیر اب معاملات بات چیت کی منزل سے آگے بڑھ گئے تھے، ساوتری کی دلچسپی کا سامان ہوگیا تھا، موہن اپنے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، اور اُس کی ماں جیسے اپنے امتحان کی ـــ آج اُس کی بنجر زمین پر، بڑی اُمید، بڑی پیار رتھنا کے بعد، ایک درخت تناور درخت، اُگ آیا تھا، اب اُس میں پھول اور پھل لگنے کا وقت قریب آرہا تھا، ساوتری خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی ـــ اب موہن نے بی اے پاس کرلیا تھا، باپ اُسے قانون پڑھانا چاہتا تھا، ـــ وکالت، ایک زمیندار کے لیے، زیادہ کارآمد پیشہ ہے، ساوتری کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا، مگر اب وہ دو سال اور صبر کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، پھر لڑکی والے بھی اب زور مار رہے تھے، اجیت کے لئے، باہر اور اندر، ایک ساتھ دو حملے تھا، دوگنا مشکل ہوگیا، لڑکی والے دو سال ٹالے جا چکے تھے، اب بی۔ اے کا عذر بھی باقی نہیں تھا، قانون، ڈاکٹری، انجینیرنگ، ملازمت، تجارت، یہ سب تو زندگی کے کاروبار ہیں، اس کے لئے کہیں شادی رکتی ہے، پیدائش، موت، شادی، یہ سب قدرت کے کام ہیں، ان کو اپنے وقت پر کوئی بھی نہیں روک سکتا، جنگ ہو، یا امن ـ یہ کام ہوتے ہی رہتے ہیں، پھر زمیندار کی لڑکی، زمیندار کا لڑکا، اُن کے لئے روزگار کی کیا فکر، روزی اسے تو کھیت سے ملتی ہے، اور وہ کھیت کی دولت سے مالا مال تھا، جو سونا اُگلتے ہیں، اور سونے کی قیمت متعین کرتے ہیں ـــ موہن کے لئے اجیت نے کیا کیا نہیں کیا تھا، وہ پڑھ رہا تھا، اور باپ اُس کی ساری زندگی کے لئے دولت اکٹھا

کر رہا تھا، اور ماں گھر جوڑ رہی تھی — اب شادی کا ٹلنا، مشکل، بلکہ ناممکن ہو گیا — جنوری کی ۲۲ر تاریخ مقرر ہو گئی —— ایک مہینہ کا وقت تھا، مگر وقت دن اور گھڑی سے نہیں، حالات اور خیالات سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، تکلیف کے دن بڑے ہوتے ہیں، اور آرام کے چھوٹے، تکلیف میں وقت بڑھ جاتا ہے، آرام میں اُس کی مدت کم ہو جاتی ہے، مگر یہاں بات اُلٹی تھی، خوشی تھی، انتہائی خوشی، کوئی فکر، کوئی کام، کوئی انتظام نہیں کرنا تھا، صرف وقت کا انتظار تھا، وہ پہاڑ ہو رہا تھا، جو کاٹے نہیں کٹ رہا تھا، اُس سے ایک طرف ساوتری اور دوسری طرف موہن ٹکرا رہا تھا —— اس ٹکر سے موہن کا بُرا حال ہو گیا، ماں جتنی خوش، بیٹا اُتنا ہی بے چین تھا، وہ چپ تھا، بالکل چپ، مگر اس کا دماغ بھن رہا تھا —— وہ دیہات کے نام سے ہی اب کانپتا تھا، اور پھر یہ دیہات کی شادی، یہ تو بڑی کٹھن چیز ہے، دیہات کی لڑکی کے طور طریقہ کا بدلنا کچھ آسان ہے! یہ سال دو سال کا نہیں، پوری نسل کا کام ہے، خود اُس کی ماں کو شہر میں رہتے ہوئے دس سال ہو گئے، پھر بھی وہ ابھی تک ویسی ہی ہے جیسی گاؤں سے آئی تھی، مگر وہ تو ماں ہے، اپنے وجود کی یادگار، عزت کی چیز، پوجے کی چیز، وہ جتنی بھی پرانی ہو عزیز ہے —— مگر بیوی، وہ تو ایک چلتا سکہ ہے، زمانہ اور وقت کے موافق، وہ اپنی زندگی، کسی پرانے خیال کی لڑکی کے ساتھ، ہنسی خوشی سے کیسے گذار سکتا ہے، زمانہ کتنی تیزی سے بدل رہا ہے، ماں کو اس کا احساس نہیں، وہ خود تو ریل کے دور کی ہے، ہوائی جہاز کی رفتار کیا جانے، اُس نے ایک زمیندار کے گھر میں آنکھ کھولی، دوسرے زمیندار کے ساتھ زندگی گذاری، وہ بھلا ایک گریجویٹ کے خیالات کو کس طرح سمجھ سکتی ہے، وہ اس زمانہ کی تبدیلیوں کو بری نگاہ سے

دیکھتی ہے، وہ یہ کبھی نہیں مان سکتی کہ اس کے زمانہ کی برائیاں، اب خوبیاں
بن گئی ہیں، دس برس کے بعد ہر سچ جھوٹ ہو جاتا ہے، یہ ایچ، جی، ویلز کا قول
ہے، گیتا کا نہیں — ہر پودا ہر جگہ نہیں جم سکتا، زمین کی صلاحیت شرط ہے،
ویلز کے قول کو قبول کرنے کی صلاحیت ہم میں پیدا ہو چکی ہے، مگر ہمارے
ماں باپ میں نہیں، باپ نے ترقی کے خارجی اثرات بھی بہت قبول کئے کہ بی۔اے
تک، حیلہ حوالہ سے، ہماری شادی ٹال دی، مگر ایک کالج کی پڑھی لکھی لڑکی
سے تو وہ بھی شادی پر کسی طرح تیار نہیں ہوگا، کوئی بات بن نہیں آتی، کوئی صورت
سمجھ میں نہیں آتی، ان لوگوں کو یہ کیسے سمجھایا جائے کہ زندگی ایک مکمل چیز ہے،
وہ ٹکڑوں میں نہیں بٹ سکتی، ماحول اور حالات بدلے تو خیالات بدل
جائیں گے، اور اس کا اثر داخلی اور خارجی دونوں زندگیوں پر ہوگا، میں دیہات
میں ضرور پیدا ہوا، مگر وہ اب میرے لئے پردیس ہے، اس دیس کا رشتہ صرف
ماں باپ کے دم سے ہے، اگر بیوی بھی اسی رشتہ کی دوسری کڑی ہوگی تو ہماری
پوری زندگی ترقی سے تنزل کی طرف لوٹ پڑے گی، زندگی ترقی ہے، تنزل
موت، اور موت مجبوری کا نام ہے، اپنی قوت بھر ہمیشہ اس سے بچنا چاہیئے،
اور اگر وہ دباؤ کی شکل میں پیچھا کرتی ہے تو اس سے فوراً بھاگ جانا چاہیئے،
دور، بہت دور .... اور وہ اچانک کلب سے، ٹینس کا بلّا ہاتھ میں لئے
ہوئے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس نے آج اپنی زندگی میں پہلا آزادانہ قدم اٹھایا تھا،
وہ بالکل بدحواس ہو رہا تھا، وہ اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا، وہ سوچ
بھی نہیں سکتا تھا، وہ تو اس وقت گویا کلوروفارم کے نشہ میں تھا، اس حالت
میں جو بھی کر جاتا کر جاتا، ورنہ ہوش آنے پر تو وہ شاید اپنے دل سے مجبور ہو جاتا،
ایسے شفیق ماں باپ سے، اس طرح بھاگنا، خواہ وہ چند ہی دن کے لئے ہوتا

اُس کے لئے کوئی آسان بات نہیں تھی، ماں باپ کی پیار کی زیادتی نے اُس کی طبیعت میں ضد اور دل میں گداز دونوں ہی پیدا کر دیا تھا ـــ مگر اب وہ ٹرین میں تھا، ٹرین بھاگ رہی تھی، اُس کے پکڑے جانے کا خوف گھٹ رہا تھا، اور اِس تحفظ کے احساس سے وہ ہوش میں آتا جا رہا تھا ـــ مگر ابھی اُس نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ وہ یہ بارہ دن کہاں کاٹے گا، اور اس درمیان میں اُس کا کیا پروگرام ہوگا، وہ گم نام رہے گا، یا اپنی خیریت اپنے والدین کو لکھ دے گا، اور اُن کو یہ بتا دے گا کہ وہ اُن سے نہیں، اپنی اس شادی سے بھاگا ہے، اور اُس کی وجہ یہ ہے، ممکن ہے وہ لوگ بات سمجھ جائیں، مان لیں، اور جو نہ مانیں تو؟
ـــ لیکن اس کا علاج بھی کیا ہے، وہ ایک تدبیر سوچتا، اُس پر پہلے سے غور کرتا، پھر اُس کو مسترد کر دیتا، پھر دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی......اور
...انھیں خیالات میں وہ گم تھا، گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی، وہ پلیٹ فارم پر اُترا، ٹی اسٹال پر اُس نے چائے پی، بک اسٹال سے اُس نے کچھ اخبار اور پرچے خریدے، اور اپنے ڈبہ میں واپس آ کر وہ اخبار دیکھنے لگا ـــ ٹی ٹی ای داخل ہوا، اُس نے ٹکٹ چیک کرنا شروع کئے، کوئی صاحب ایک برتھ پر سو رہے تھے، ایک لڑکی نے اُن کا ٹکٹ دکھایا، اس وقت موہن کو یہ احساس ہوا کہ اِس درجہ میں کوئی لڑکی بھی ہے، اچھی خاصی لڑکی، مگر ـــ وہ ابھی اس سے زائد اُس کے بارہ میں کچھ سوچ نہیں سکا تھا کہ ٹی ٹی ای خود اُس کے پاس پہنچ گیا ـــ اُس نے اپنی زمیندارانہ، ہاں وہی پرانی زمیندارانہ شان سے، جیب میں ہاتھ ڈالا ـــ مگر یہ کیا؟ ہاتھ تو جیب کے پار تھا ـــ گھر سے بھاگتے ہی یہ پہلی ٹھوکر تھی ـــ ٹی ٹی ای کوئی شریف النسان تھا، مردم شناس، اُس نے مسکرا کر پتہ پوچھا ـــ "موہن سنگھ ۵/۴ اجیت سنگھ، پھول پور، کان پور"، مختصر سا

جواب تھا ــــ ٹی ٹی ای چلا گیا، مگر موہن کو اپنی اِس اچانک تہی دستی کی پریشانی میں مبتلا کر گیا ــــ اب رات گہری ہو چلی تھی، سردی بڑھ رہی تھی، وہ ہوا کی زد سے بچنے کے لئے اوپر کی برتھ پر جا کر لیٹ گیا، آزردہ و پریشان، اُس نے خیالات بدلنے کی کوشش کی، پھر کچھ پڑھنا شروع کر دیا، لڑکی اُٹھی اُس نے اپنا ہولڈال کھولا، اپنی سیٹ پر بستر جمایا، ایک کمبل اُس نے سامنے والی سیٹ پر سوئے ہوئے بڑے صاحب کے اوپر ڈالا، شاید وہ اُس کا باپ تھا ــــ دوسرا کمبل اور ایک تکیہ اُس نے موہن کو اوپر تھمایا ــــ موہن کے لئے یہ بالکل عجیب بات تھی، وہ گھبرا گیا، اُس کو سردی معلوم ہو رہی تھی، یا نہیں، اِس کا بھی اُس کو، اس وقت، کوئی احساس نہیں تھا، کسی نے اب تک اُس کی ایسی کوئی مدد نہیں کی تھی، وہ تو خود جانے کتنوں کی ایسی مدد کر چکا تھا، مگر روز لوگوں کو دینے والا آج خود ایک کمبل کا محتاج تھا، اُس کی خودداری کو سخت ٹھیس لگی ــــ

"میں بالکل ٹھیک ہوں، اِس کی ضرورت نہیں ہے"

"آپ بالکل ٹھیک نہیں ہیں، اس کی ضرورت ہے"

یہ دو فقروں کی مختصر سی گفتگو تھی ــــ مگر لڑکی کے جواب میں نہایت شائستگی، اعتماد، خلوص اور درد تھا ــــ وہ خاموش ہو گیا، تکیے اور کمبل نے واقعتاً اُس کو بہت آرام دیا، جسمانی بھی، اور ذہنی بھی، اچھا سلوک جسم سے زیادہ دل کو آرام پہنچاتا ہے، وہ اب اس فلسفہ پر غور کرنے لگا ــــ لڑکی سامنے بستر پر لیٹی اور سو گئی، مگر وہ موہن کے خیالات کو شاید اپنی پہرہ داری کے لئے جگا گئی تھی ــــ موہن کا دل اُس کا بہت شکر گذار تھا، وہ لڑکی صورت سے، یا سیرت سے، یا دونوں سے، اُسے بہت بھلی معلوم ہونے لگی، موہن اُس کے بارے میں کچھ نہیں

جانتا تھا۔ نہ سوچ سکتا تھا، پھر بھی وہ اُس کے بابت سوچ رہا تھا ــــ جیسے کوئی مضمون لکھنا ہے، کوئی خیال پہلے سے موجود نہیں ہے، قلم چلانا شروع کر دیا، خیالات آپ سے آپ آنے لگے ــــ لڑکی صورت کی بُری تو نہیں ہے، اچھی بھلی ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوگی، تعلیم یافتہ بہت نہ بھی ہو، تو سلیقہ مند تو ہے، بالکل تعلیم یافتہ جیسی ــ کتنا مختصر، کتنا جامع، کیسا شستہ جواب تھا، ان پڑھوں کی یہ بات نہیں ہو سکتی، بی، اے نہ ہو نہ سہی، مگر تہذیب یافتہ ضرور ہے، تعلیم کا اصل منشا شائستگی اور سنجیدگی ہی تو ہے، جس میں یہ ہے وہ بلاشبہ تعلیم یافتہ ہے، ڈگری ہو، نہ ہو، اس سے کیا ــــ مگر پھر اک ذرا سی بات سے اس کے بارہ میں اتنی خوش ظنی کیوں کی جائے، ممکن ہے یہ ایک اتفاقی بات ہو، لیکن برجستہ ایک معقول جواب کوئی معمولی بات نہیں ہے، وہ انسان کی زندگی کے پورے پس منظر کو بتاتا ہے ــ کسی عقل مند نے ایک لڑکے کے دروازہ بند کرنے، کتاب اُٹھا کر میز پر رکھنے، اور اپنے ناخن کو صاف رکھنے کے سلیقہ کو دیکھ کر اُس کی ساری صلاحیت کے بارے میں رائے قائم کر لی تھی، اس لڑکی نے اس وقت جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے، بات تو وہ ذرا سی ہے، مگر معمولی نہیں ــــ ان باتوں کو وہ بار بار مختلف زاویوں سے سوچتا رہا، اور پھر مختلف زاویوں سے اُس کے خاموش چہرہ کو شاید اپنے خیالات کی تصدیق کے لئے دیکھتا رہا ــــ بار بار دیکھنے سے اُس کا چہرہ موہن کو دل کش تر نظر آنے لگا، یا تو اُس کے چہرہ ہی میں دل کشی بڑھ رہی تھی، یا خود موہن کے خیال میں، مگر موہن کو اس وقت یہ بات بالکل یاد نہیں آئی کہ اچھا برتاؤ انسان کی شکل وصورت میں غیر معمولی جاذبیت پیدا کر دیتا ہے، ممکن ہے اُس کے دل پر بھی اثر رہا ہو، مگر دماغ، وہ تو شاید آج پھر پندرہ برس کے بعد بوکھلا سا گیا تھا ــــ لڑکی ان

باتوں سے بالکل بے خبر سو رہی تھی، اُس کا بھولا، خاموش چہرہ کہہ رہا تھا، ہم اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں نہیں سوچتے، ہم خاموش اپنا کام کرتے ہیں، دنیا کی تمام باتیں سنتے ہیں، مگر اُن سب کا تجربہ خود اپنی ذات پر نہیں کرتے، زیادہ سوچنے سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے، یہ مردوں کی کمزوری ہے، عورتیں اپنا فرض ادا کرتی ہیں، اور چین سے میٹھی نیند سوتی ہیں، جیسے میں اس وقت اپنا کام کر کے سو رہی ہوں، اور ایک تم ہو جو جانے اس وقت کیا کیا سوچ رہے ہو، اور اپنے ماں باپ کی زندگی کو کوفت میں ڈال کر جانے کہاں جا رہے ہو —— یہ فرار کی راہ مصیبت کی راہ ہے، اپنے لئے بھی، اور اپنے تعلق والوں کے لئے بھی، جس کی ابتدا یہ ہے، اُس کی انتہا کیا ہو گی —— کتاب کی باتوں پر مت جاؤ، کتاب اور عملی زندگی میں بڑا فرق ہے، منطق و فلسفہ نظریاتی باتیں ہیں، ان سے گھریلو زندگی خوش گوار اور پُرسکون نہیں بنائی جا سکتی، ولایتی پودا یہاں جما ہے، اور نہ جمے گا —— تم انگریزی پڑھتے ہو، تم انگریزی تہذیب کی نقالی بھی کرنا چاہتے ہو، مگر آج بھی تم یورپ میں اپنا سر یہ کہہ کر بلند کرتے ہو کہ "ہمارا ہندوستان ساوتری، اور سیتا کا دیس ہے" —— اور اُس وقت تم اپنی بغل میں بیٹھی ہوئی بیوی کی طرف نہیں دیکھتے جس کے ہونٹ اور ناخن رنگ سے سرخ، اور چہرہ پاؤڈر سے سپید ہوتا ہے —— یہ جھوٹی اور دورُخی زندگی کب تک! ——

ٹرین اُس کے مستقر پر رُک چکی تھی —— موہن اپنی برتھ سے اُترا، اُس نے تکیہ اور کمبل کو سمیٹا، لڑکی کو بیدار کر کے اُس کے سپرد کیا، اور شکریہ ادا کرتا ہوا پلیٹ فارم پر پہنچ گیا —— لڑکی بھی اُس کے پیچھے

پیچھے دروازہ تک آئی، اُس نے کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر، اس تاریک خاموشی میں، اُس کے ہاتھ پر سو سو روپیہ کے دو نوٹ رکھ دیئے ـــــ

"اِس کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

"اِس کی ضرورت بے شک ہے" ـــ لڑکی نے نوٹ جیسے اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا ـــــ

"اچھا، یہ رقم آپ کو کس پتہ پر واپس کی جائے گی؟"

"۲۲ر جنوری سے قبل ـــ سنجو گتا، C/O مہندر سنگھ، پروایان، متھرا" ـــ اور ۲۲ر جنوری کے بعد، C/O موہن سنگھ، پھول پور، کان پور" ـــــ

ٹرین جا چکی تھی، نوٹ بدستور موہن کے ہاتھ میں تھا، اور اُس کی نگاہ چمکتی ہوئی ریل کی پٹری پر، دل ٹرین کے ڈبہ میں، اور دماغ ماں باپ کے پاس ـــــ

سہاگن بیوہ

اِس خاندان میں، کئی پشتوں سے، صرف ایک لڑکا پیدا ہوتا تھا، اور بس ــ لڑکی سات پشتوں سے کوئی ہوئی ہی نہیں تھی ــ خود حمید کے یہاں بھی، حسبِ روایت، ایک وحید پیدا ہو کر رہ گیا، سال پر سال گذرنے لگے، اور کسی دوسرے بچہ کی صورت نظر نہ آئی ــ کاروبار معمولی تھا، ارزانی کا زمانہ تھا، چھوٹا خاندان، خوش حال گھرانا تھا، کوئی پریشانی نہیں تھی، بالکل سکون تھا، مگر کبھی کبھی ایک دم سکون بھی آدمی کو کاٹنے لگتا ہے۔
وحید آٹھ برس کا ہو گیا تو حمید کی ماں کو پریشانی ہوئی کہ دردانہ کے دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوتا، اُس نے پہلے تو بہو کا کچھ دوا علاج کرایا، پھر حمید کو دوسری شادی کی ترغیب دینے لگی، وہ انکار کرتا رہا، اور یہ اصرار کرتی رہی ــ حمید اکلوتی اولاد، بیوہ ماں کا بے حد لاڈلا، نہ ماں نے کبھی اُس کی کسی فرمائش پر نا کی تھی، اور نہ اُس نے کبھی ماں کے حکم سے انکار، بہو کے آنے پر بھی اِس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، ــ وہ دردانہ کو، درجنوں لڑکیوں میں چن کر لائی تھی، اُس کو اُس کی صورت، اور سیرت پسند آگئی تھی، اور حمید نے، اُس کو بن دیکھے، ماں کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا ــ عورت تو سب ہی ہوتی ہیں، ایک سے ایک حسین، پری پیکر، بچے بھی، معمولاً سب ہی

پیدا کر لیتی ہیں، ایک سے لے کر، ایک درجن تک، مگر مرد کے دل کو موہنے کا گُر کم ہی عورتیں جانتی ہیں، یہ اللہ کی دین ہے، جو وہ کسی کسی کو دے دیتا ہے، دُردانہ کو مبداء فیاض نے، اپنی رحمت خاص سے، یہ ہنر عطا کر دیا تھا، اُس نے آتے ہی، وحید کے دل کی جاگیر پر قبضہ جما لیا، اتنا مستحکم کہ اُس کو وہاں سے ہٹانا حمید کی ماں کے لئے مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو گیا تھا ـــــ عورت کی عجیب فطرت ہے، اُس کے یہاں ایک بام پر دو ہوا چلتی ہے، بیٹی کے لئے، اُس کو اپنی جوانی کے تقاضے، یاد رہتے ہیں، مگر بہو کے لئے وہ یہ بھول جاتی ہے، بہو کو وہ بچہ پیدا کرنے کی بس ایک مشین سمجھتی ہے ـــــ حمید کی ماں کو بھی، اس موقع پر، اپنے شوہر کی دیوانگی یاد نہیں رہی، جس نے، اُس کی خاطر، اپنی ماں کو اسی وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ وہ بھی اُس کو دوسری شادی کے لئے یہ کہکر مجبور کرتی تھی کہ، اک آنکھ کو آنکھ نہ کہو، اک پوت کو پوت ـــــ مگر حمید کی ماں کے خیال میں اُس کا اپنا بیٹا، اُس کی ساس کے بیٹے سے، مختلف تھا، یا اُس کی اپنی بہو خود اُس کی جیسی جادوگرنی نہیں تھی ـــــ مگر اُس غریب کو زمانہ کی ترقی کا علم نہیں تھا کہ اُس کا شوہر جو کچھ، اُس سے چھپ کر، شاہدان بازاری کے یہاں، حاصل کرتا تھا، وہ اُس کے بیٹے کو، اپنی خلوت ہی میں، میسر آ رہا ہے ـــــ بوڑھے، اور بچے، یکساں ہوتے ہیں، اُن کو بہلانے کے لئے کچھ کھلونے چاہئیں، دردانہ نے امور خارجہ ساس کے سپرد کر کے، خاموشی سے امور داخلہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی، وہ ساس کے اس مطالبہ پر، خود، کوئی سرد یا گرم جنگ، اُس سے نہیں کرنا چاہتی تھی، اُس کو اِس کی ضرورت ہی نہیں تھی، دن میں ساس، اُس کے خلاف جو محاذ بناتی تھیں، وہ رات کو شوہر کے پہلو میں لیٹ کر، ایک کرن بکھیر سے،

اُسے مسمار کر دیتی تھی، اور پھر دن میں ماں بیٹے کی بحث سن کر محظوظ ہوتی رہتی تھی ـــــ ماں کہتی "بیٹے! تم نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی، یہ ایک آخری خواہش ہے، اس کو بھی پوری کردو، میرا دل خوش ہو جائے گا، اور تم پھولو پھلو گے" ـــــ حمید اُن کو سمجھاتا "اماں! میں نے آپ کی بات کب نہیں مانی، یہ دردانہ میری لائی ہے، یا آپ کی، اس نے کبھی آپ کو کوئی شکایت کا موقع دیا ہے ـــ رہا بچے، تو وہ اللہ کی دین ہیں، یہ بانجھ تو نہیں، جیسے ایک ہوا ہے، دوسرا، تیسرا ابھی ہو سکتا ہے، اور اگر اور نہ بھی ہو، تو ایک وحید ہی کیا کم ہے، جس گھر میں درجنوں ہوتے ہیں وہاں بھی ایک ہی نام پیدا کرتا ہے، آپ ہی تو ہمارے ابا مرحوم سے کہا کرتی تھیں ؎ فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص ـــــ ـــــ معلوم نہیں اب آپ کی نگاہ میں میں فخر خاندان ہوں، یا ننگ خاندان، مگر آپ یقین رکھیں کہ آپ کی دعا سے، وحید انشاء اللہ ضرور فخر خاندان ہو گا" ـــــ ماں تو کہتی "مگر بیٹے، پھر وہی اک آنکھ!" ـــــ حمید ہنس کر کہتا "اماں! نلسن کے بھی تو ایک ہی آنکھ تھی، جس پر انگریز قوم آج تک فخر کرتی ہے، آپ کے پاس تو ماشاء اللہ چار آنکھیں ہیں، پوری چار، اور پھر بھی اگر آپ کے خیال میں یہ کچھ کم ہیں تو آپ بس اللہ سے دعا کرتی رہیئے، یہی دردانہ وہ بھی پورا کرے گی" ـــــ ماں پوچھتی "کیا تو اللہ کا گھر دیکھ آیا ہے؟" ـــــ حمید اس کو طنزاً چھیڑتا "اماں! وہاں مردوں کے جانے کی کہاں اجازت ہے، وہاں تو صرف عورتیں جاتی ہیں، دردانہ دیکھ آئی ہے، کہتی ہے، اللہ کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں" ـــــ ماں ایک دم بات کا رُخ بدلتی "میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے، بہت اچھی ہے، میں نے

اُسے پسند بھی کر لیا ہے"۔۔۔ حمید ماں سے ٹھٹولی کرتا "اماں! آپ نے اُس کی زبان بھی ناپ لی ہے، دُردانہ سے بڑی تو نہیں ہے، اِس سے چھوٹی تو ذرا مشکل ہی سے ملے گی!"۔۔۔ ماں کچھ جھلاتی "اچھا! تو میرے ساتھ دل لگی کرے گا، یا صاف جواب دے گا"۔۔۔ اب حمید سنجیدگی سے اُسے سمجھاتا "آپ ہی نے تو بزرگوں کا قول سنایا تھا کہ مرد کی تقدیر سے اولاد، اور عورت کی تقدیر سے روزی ۔۔۔ اب اگر میری تقدیر میں مزید اولاد نہیں ہیں، تو کیا نئی آنے والی اپنے گھر سے لائے گی ۔۔۔ آپ کو یاد نہیں کہ ملکہ ممتاز محل نے، مرتے وقت، شاہ جہاں کو دوسری شادی کرنے سے منع کیا تھا کہ دوسری بیوی سے بھی لڑکے ہوں گے، اور تخت کے لئے سوتیلے بھائیوں میں قتل و خون ہوگا ۔۔۔ تو کیا آپ وحید کے لئے قتل و خون کا سامان کر رہی ہیں ۔۔۔"
یہ قتل و خون والی بات ذرا موٹی، اور سیدھی تھی، وہ بڑی بی کی سمجھ میں آگئی ۔۔۔ اور یہ روز روز کا قصہ ختم ہوا ۔۔۔ صبر کا پھل میٹھا، دوسرے ہی سال، دس برس کے بعد، دردانہ کے خزاں رسیدہ باغ میں، نرگس کا ایک پھول کھل آیا، ۔۔۔ مگر افسوس! کہ وہ ڈالی خود ٹوٹ گئی ۔۔۔ اور قبل اس کے کہ میدان خالی پا کر، بڑی بی، حمید پر شب خون مارتیں، فرشتۂ اجل نے اُن کو بھی آ دبوچا ۔۔۔ اب حمید تھے، اور دردانہ کے یہ دو پھول، وحید اور نرگس حمید ان دونوں پھولوں کو، اپنے گلدستۂ دل میں سجا کر، دردانہ کی خوشبو سے اپنے مشام دل کو معطر کئے رہتا ۔۔۔ ماں، بیوی، دونوں چلی گئی تھیں، گھر خالی تھا ۔۔۔ اور اُس کا کاروباری باغ پھولوں سے لدا ہوا تھا، روز آئے دو ایک گاہک اُس کے پاس آنے لگے، مگر اُس کا ایک ہی جواب تھا "میرے خانۂ دل میں تو دردانہ اب تک آباد ہے، اور یہ باغ اُس کے بچوں کا

کا ہے "میں تو صرف ان کا مالی ہوں" ـــــ اور واقعی وہ ۲۳ سال کی عمر میں ان بچوں کا مالی ہی بن گیا تھا، اُس نے ان بچوں کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی ـــــ نرگس نے تو ماں کو دیکھا ہی نہیں تھا، صرف بھائی سے سنا تھا کہ اُس نے اُس کو جنم دے کر، خاندان کی ایک بچے کی روایت توڑی، اور خود جنم جنم کے لئے ٹوٹ گئی ـــــ یہ سن کر نرگس کہتی "معلوم ہوتا ہے کہ میں ازل سے ہی پھوٹی قسمت لے کر آئی ہوں" ـــــ جب یہ دونوں بچے اپنے سن کو پہنچے تو حمید کو اُن کی شادی کی فکر ہوئی، وحید اللہ کے فضل سے ڈپٹی کلکٹری کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو گیا، اُس زمانہ میں اس عہدے کی بڑی توقیر تھی، اُس کے لئے ایک سے ایک رشتے آنے لگے، مگر حمید نرگس کی شادی بھی اُسی جوڑ کی کرنا چاہتا تھا، مگر اُس میں ایک دقت تھی کہ نرگس صورت شکل کی تو نرگس تھی، مگر تعلیم واجبی تھی، یوں گھر گرہستی میں وہ طاق تھی، مگر نئی روشنی کے سحر زدہ نوجوان، انگریزی پڑھی لکھی بیوی ڈھونڈتے تھے ـــــ حمید خاندانی تاجر تھا، تجارت کے گر سے خوب واقف تھا، اُس کو جب نرگس کے لئے وحید کے جوڑ کا کوئی لڑکا لوکل اور فارن کرنسی میں نہیں ملا، تو اُس نے وحید کو راضی کر کے بارٹر ڈیل (مال کے بدلے مال) کے تحت ایک رشتہ طے کر لیا۔ قریبی ضلع میں ایک وکیل صاحب، ایک لڑکا، اور ایک لڑکی چھوڑ کر، قضا کر گئے تھے، بیوی اُن کی بھی پہلے ہی مر چکی تھیں، اُن کے گھر کا ماحول بھی ان ہی جیسا تھا، اُن کا لڑکا شمیم ڈاکٹر تھا۔ یہ دونوں ہم پلّہ شادیاں خوب دھوم دھام سے ہوئیں، خصوصاً حمید نے اپنے دل کا ارمان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ـــــ البتہ جب نرگس کو سہرا باندھنے کے لئے اندر بلائے گئے تو وہ بڑی طرح رو رہے تھے، جانے وہ آنسو خوشی کے تھے،

یا غم کے، بیٹی کی شادی میں تو یہ دونوں جذبے ملے ہوتے ہیں، فرض کی ادائیگی کی خوشی، اور جدائی کا غم ــــ اُنہوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بیٹی کے سر پر سہرا باندھا، پھر اُس کا گھونگھٹ اُٹھا کر، سُرخ عروسی جوڑے میں، اُس کا چہرہ دیکھا ــــ ارے! یہ تو وہی دردانہ تھی، جس کو پچیس سال پہلے اُس نے اپنے حجلۂ عروسی میں دیکھا تھا، اُس نے فوراً اُس کا چہرہ ڈھانپ دیا، اور گلوگیر آواز میں برجستہ یہ شعر پڑھا۔

"آئی بہار گلشن گُل سے بھرا ہے، لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل"

خواتین سمجھ گئیں، حمید کو دردانہ یاد آ گئی ہے، اور کیوں نہ یاد آتی، بیٹی تو بالکل ماں پر تھی ــــ خواتین نے حمید کو مبارک باد دی، اور تحمل کی تلقین کی "بس دعا کیجئے کہ نرگس کو بھی ماں ہی جیسا پیار کرنے والا شوہر ملے!" ــــ حمید نے "آمین، ثم آمین" کہا، اور اپنے آنسو خشک کرتا ہوا باہر چلا گیا ــــ نرگس نے ڈاکٹر شمیم کا، اور پروین نے ڈپٹی کلکٹر وحید کا گھر آباد کر لیا ــــ دونوں کی زندگیاں ہنسی خوشی بسر ہونے لگیں ــــ نرگس کی گود سال کے اندر ہی ہری ہو گئی، فرق یہ تھا کہ ماں کے یہاں بیٹا ہوا تھا، اور اُس کے یہاں چاند سی بیٹی ہوئی، ڈاکٹر شمیم کے گوشۂ چمن میں، نرگس کے ساتھ گُلِ یاسمین کا بھی اضافہ ہو گیا، ان دونوں کو دیکھ کر وہ ہر وقت پھول کی طرح کھلا رہتا ــــ ماشاء اللہ، ان کی بچی دو سال کی ہو گئی، مگر اس تین سال کا زمانہ اُس کی بہن کے یہاں الانتظار اشد من الموت میں کٹ گیا، اور پروین کی کوکھ سونی ہی رہی ــــ حمید کی خاندانی روایت کے مطابق، شادی کے فوراً بعد ایک لڑکا ہو جاتا تھا، پھر اُس کی تجدید البتہ نہیں ہوتی تھی، مگر وحید کے یہاں تو یہ

روایت بھی ٹوٹتی نظر آئی۔ مادہ حمید کو اپنی نسل ختم ہوتی ہوئی معلوم ہوئی ۔۔۔ اب اس کو اپنی ماں کی نصیحت یاد آنے لگی ۔۔۔ انسان کے خیالات دو صورتوں میں بدلتے دیر نہیں لگتی، بڑھاپے میں، یا اچانک دولت، اور اقتدار مل جانے پر ۔۔۔ حمید اب بوڑھا بھی ہو گیا تھا، اور ایک ڈپٹی کلکٹر کا باپ بھی، اُس کی سوچ کا رخ بدل گیا، اُس نے ایک روز وحید کو اشارۃً دوسری شادی کا مشورہ دیا، خاطر خواہ رد عمل نہیں ہوا تو اس نے اصرار کی صورت اختیار کی، پروین میں شاید دردانہ کی سی سحر طرازی نہیں تھی، اُس کے احتجاج کے باوجود، وحید کی دوسری شادی ہو گئی ۔۔۔ نئی دلہن، نئی بہار لے کر آگئی، ایک ہی گھر میں، ایک کمرہ بقعہ نور بن گیا، اور دوسرا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب گیا ۔۔۔ اس نغمۂ شادی، اور نوحۂ غم کی آواز ڈاکٹر شمیم تک پہنچی تو وہ فوراً آیا، غم کی ماری بہن کے آنسو پونچھے، اور اس کو تسلی دینے کے لئے اپنے سینہ سے لگا لیا، اُس کی تپش سے اُس کا سینہ بھی جل اُٹھا ۔۔۔ اس نے حمید سے، اُس وقت پروین کو اپنے ساتھ لے جانے کی، اجازت مانگی، اُن لوگوں نے سوچا کہ "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" اس رنگ و بو کی محفل سے، اُس وقت پروین کا ہٹ جانا ہی اچھا ہے ۔۔۔ کرتے وقت تو ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے! مگر بقول غالب ؂

کام اچھا ہے وہی جس کا آل اچھا ہے

پروین جس گھر میں، تین سال قبل، وحید کے ساتھ، دلہن بن کر آئی تھی، آج اُس گھر سے، بھائی کے ساتھ، ایک بیوہ کی شکل میں روانہ ہو رہی تھی ۔ دروازہ پر اُس کو ٹھوکر لگی، پلٹ کر اُس نے، اِس گھر پر حسرت کی نظر ڈالی، اور سوچنے لگی کہ میکے سے آتے وقت مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ "ڈولے میں سسرال جاؤ، جنازے

اور اب چپرکھٹ میں وہاں سے نکلتا آج مجھے زندہ اسی تانگے میں کیوں سوار کیا جا رہا ہے ۔۔۔ اس نے یہ نعرہ نہیں سنا تھا "بادشاہ مرگیا، اللہ بادشاہ کو سلامت رکھے" ۔۔۔ یعنی اُس کا غم، اب نئے آنے والے کی خوشی بن گیا ہے ۔۔۔ وہ زار وقطار روتی ہوئی بھائی کے گھر میں داخل ہوئی ۔۔۔ ابھی وہ اپنے دل کا حال نرگس سے بیان بھی نہیں کرپائی تھی کہ ڈاکٹر شمیم نے، اُسی تانگے میں، اپنی بیوی کو اسٹیشن چلنے کو کہا، نرگس کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، وہ دردانہ کی بیٹی تھی، ماں کی صورت ہی نہیں، اُس کا ذہن بھی پایا تھا، اور اُس کی دلیری کی ادائیں بھی، مگر سہ ہر سخن وقتے وہر نکتہ مقامے دارد ۔۔۔ اُس نے سوچا، اس وقت شوہر بہن پر زیادتی کی وجہ سے، طیش میں ہے، خاموشی سے اُس کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیئے" دو شام کی ٹرین سے میکے پہنچ گئی ۔۔۔ حمید کو اُس کی اچانک آمد پر سخت تعجب ہوا ۔۔۔ تدبیر کند بندہ و تقدیر زند خندہ ۔۔۔ ڈاکٹر شمیم نے اپنے خسر سے کہا "میری بہن اب مستقلاً میرے یہاں رہے گی، اور آپ کی صاحبزادی، اپنی بچی کے ساتھ، آپ کے یہاں ۔۔۔ مجھے نہ اپنی بہن کے لئے طلاق لینا ہے، اور نہ اپنی بیوی کو طلاق دینا ہے، پروین کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اُس کی پاداش میں ہم تینوں، اپنی اپنی جگہ، ساری عمر جلتے رہیں گے، اور شاید آپ بھی، میری بیوی اور بچی کا خرچ البتہ پابندی سے آتا رہے گا" ۔۔۔ بچپن میں غم کا احساس نہیں ہوتا، جوانی میں غم برداشت کرنے کی قوت ہوتی ہے، مگر بڑھاپے میں سوئی کی چبھن بھی بھالے کا گھاؤ معلوم ہوتی ہے ۔ حمید کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ۔۔۔ اُس اندھیرے میں اُس نے دردانہ کو دیکھا، وہ نرگس کو لپٹائے، اُس کے آنسو خشک کر رہی ہے، اور حمید سے کہہ رہی ہے کہ "تم نے مجھ مردہ کو تو اب تک نہیں بہلایا، اور اپنی منت مراد کی بیٹی کو زندہ دفن کر دیا" ۔۔۔ حمید سر پکڑ کر

وہیں بیٹھ گیا، لوگوں نے اُس کو اُٹھانے کی کوشش کی، لیکن اُس کی تو جیسے اب کمر ہی ٹوٹ گئی تھی ــــ سال پر سال گذرتے رہے، اُس کی آنکھوں کی تارا نرگس، اُس کے در پر، سہاگن بیوہ بنی، دن رات، اپنی اُجڑی مانگ پر، آنسو بہاتی رہی ــــ حمید بیٹی کے غم میں روز بروز گھلنے لگا، صحت بالکل جواب دے گئی، اُس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا، اُس کی اپنی دنیا اُجڑ گئی، اُس کا بڑھاپا غارت ہو گیا ــــ وہ اپنی ناعاقبت اندیشی پر دن رات کفِ افسوس ملتا رہا ــــ اور ہر مہینے، دو مہینے پر، شمیم کے یہاں پھیرے ڈالتا کہ وہ ایک بار نرگس کو اپنے یہاں آنے کی اجازت دے دے، حتیٰ کہ ایک بار وہ از خود نرگس، اور اُس کی بچی کو لے کر، شمیم کے یہاں گیا، اور مہینوں اُس کے یہاں قیام پذیر رہا ــ شمیم نے اپنے خسر، بیوی، اور بچی کی تواضع مثالی طور پر کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، بجز اس کے کہ اپنی بیوی، اور بچی کو، خود اپنے سے ملنے کا کوئی موقع نہیں دیا ــــ نرگس کو اگر ایک بار بھی، اپنے روٹھے ہوئے شوہر سے مواصلت کا موقع مل جاتا، تو شاید وہ اُس پر اپنی مرحومہ ماں کا جادو چلا لیتی ــ شمیم کو بھی غالباً اس کا ڈر تھا، اس لئے وہ اپنے آپ کو اس امتحان میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ــــ مجبوراً حمید بیٹی اور نواسی کو لے کر واپس آ گیا ــــ اور اسی طرح پندرہ سال گذر گئے ــ شمیم نے اپنی بیوی کو، اُس کے باپ کے یہاں، لاوارث نہیں چھوڑا تھا، اُس کے اخراجات نہایت پابندی سے بھیجتا تھا، البتہ اُس کی بھری جوانی میں اُس کی سیج غیر آباد تھی، شوہر کی زندگی میں، بلا قصود، صرف باپ کی کوتاہ اندیشی سے، وہ اُس کے در پر بیوگی کی زندگی گذار رہی تھی ــــ منی آرڈر تو ہر ماہ ۳ ریر تاریخ کو آتے تھے، مگر آج منی آرڈر کی وصولی کے فوراً بعد ایک تار آیا ــــ "شمیم ایک حادثہ میں گھائل ہو گیا ہے"

بیوی بچی کو لے کر فوراً آؤ"۔۔۔

تار بھیجنے والے کا نام نامانوس تھا۔ نرگس اور اُس کی لڑکی، اسی وقت جانے کے لئے تیار ہو گئیں، مگر حمید نے بیٹی کو سمجھایا کہ ممکن ہے کسی بدخواہ نے یہ شرارتاً بھیج دیا ہو، ایسی صورت میں ہم سب کا وہاں اچانک پہنچنا بڑی غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے، تم لوگ ٹھہرو، میں ابھی جاتا ہوں، اگر یہ بات خدانخواستہ صحیح ہے تو میں آکر فوراً تم لوگوں کو لے چلوں گا ۔۔۔ حمید وہاں پہنچا، معلوم ہوا وہ اسپتال میں داخل ہے، وہ اُسی وقت شمیم سے وہاں ملا، وہ بہت مجروح تھا، مگر ہوش قائم تھے، اُس نے فوراً پوچھا "نرگس اور یاسمین آگئیں؟" حمید نے بتایا کہ وہ اس منحوس خبر کی تصدیق کے لئے آیا ہے کہ کسی نے بدخواہی تو نہیں کی ہے، اور وہ اب اُسی ٹرین سے واپس جا کر صبح اُن دونوں کو لے کر آجائے گا ۔۔۔ شمیم نے حمید پہ ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی، اور کہا "اب بہت دیر ہو چکی ہے"۔۔۔ اور اپنے تکئے کے نیچے سے ایک انشورنس پالیسی نکال کر حمید کو دے دی، وہ نرگس کے نام الاٹ تھی ۔۔۔۔

صبح کو حمید جب نرگس اور اُس کی بچی کو لے کر وہاں پہنچا، تو شمیم کا جنازہ اُن لوگوں کے انتظار میں رکھا ہوا تھا ۔۔۔ ماں بیٹی نے کفن میں شمیم کا مردہ چہرہ دیکھا، اور دونوں، ہر چیخ مار کر اپنے اپنے باپ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگیں، ۔۔۔ ہاں، حمید بھی تو اب ایک بے جان لاش ہی تھا، فرق صرف یہ تھا کہ شمیم کی لاش چھپرکھٹ میں لیٹی ہوئی تھی، اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا، مگر روح دونوں کے جسم سے غائب تھی۔ نرگس اُس کے سینے سے لپٹی رو رہی تھی، اور اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے دردانہ کھڑی اُس سے پوچھ رہی تھی "اگر بہو پر سوت لاکر، بیٹی کا سہاگ یوں اُجاڑنا

تھا ماتو مجھ پہ ہی کیوں نہیں سوت لئے، میرے مرنے کے بعد، میری یادیں، اپنی جوانی کیا اسی دن کے لئے برباد کی تھی۔ اب تمھارے بڑھاپے کا کیا بنے گا، اور بیٹی کی اس زندہ لاش کو لئے کب تک بیٹھے رہ گئے......"——

حمید کو جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ، اس سانحہ کی خبر سن کر، وحید بھی وہاں پہنچ گیا ہے —— اب شمیم کی موت کے بعد پروین اس گھر میں تنہا رہ گئی تھی، بالکل بے سہارا —— وحید اس کو اپنے ساتھ لے گیا، اور قدرت کی ستم ظریفی کردہ شوہر کے یہاں پہنچ کر، بیس سال کے بعد، ایک بچے کی ماں بن گئی ——

اور حمید کے کانوں میں وردانہ کی آواز سنائی دی ۔

سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

خبطی

وسیم، فہیم سے کوئی بیس برس چھوٹا تھا، اُس کی پیدائش کے دو سال کے اندر اندر اُس کے دونوں سن رسیدہ والدین، یکے بعد دیگرے، قضا کر گئے۔ اُس کی پرورش بڑے بھائی کے ذمہ آ گئی۔ فہیم ایک معمولی کلرک تھا، وہ بھی شادی شدہ، آمدنی کم، اخراجات زیادہ، تنگی ترشی میں بسر ہوتی تھی۔ —— وسیم کا ذہن اچھا تھا، تعلیم کا شوق تھا، کھیل کود میں دلچسپی نہیں تھی، گاؤں میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی، پھر بھائی کے پاس شہر چلا آیا، یہاں مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، جلد ہی اچھا نتیجہ دکھایا، اسکول فیس معاف ہو گئی، سال میں سو فی صد حاضری نکلی، کتابوں اور کاپیوں کا انتظام بھی اسکول ہی سے ہو گیا —— وہاں ایک ہندو مدرس تھے، مدن لال، ریاضی پڑھاتے تھے، مگر ہندو مسلم تفریق میں ذرا نیچے تھے، شاگردوں کی قدر اُن کی محنت اور غربت کی بنا پر کرتے تھے، تنخواہ تو اُن کی معمولی تھی، مگر بیوی کے نام سے انشورنس کمپنی کی ایک ایجنسی لے رکھی تھی، اولاد کوئی نہیں تھی، اُس کی پاس اپنے شاگردوں کی مدد کر کے بجھاتے تھے۔ —— وسیم پر بھی اُن کی نظر پڑ گئی، اور اُس کی مشکل آسان ہو گئی —— وسیم نے انٹرنس میں اول درجہ پایا، اور ریاضی میں امتیاز بھی، فوراً اپنے ہی اسکول میں مدرس لگ گیا —— انٹرمیڈیٹ، اور بی، اے، پرائیوٹ طور پر پاس کیا،

دونوں امتحانوں میں اول درجہ بال بال رہ گیا۔ اب اس نے ایم اے میں اول درجہ حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش شروع کی، تاکہ کسی کالج میں لکچرر مقرر ہو جائے — اُن دنوں مسلم لیگ کی تحریک اپنے شباب پہ تھی، فیصلہ کن الکشن ہونے والا تھا، اسکول کے سارے طلبا، مدرسین، اور مجلس انتظامیہ کے اراکین، سب ہی اس تحریک کے بڑے پُرجوش حامی تھے — مگر اس شور میں صرف وسیم کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، وہ پاکستان کی مخالفت میں تو کچھ نہیں کہتا تھا، مگر اس مسئلہ پہ جب بھی گفتگو ہوتی تو وہ انگریزی کے اس فقرہ کو FIRST DESERVE THEN DESIRE (یعنی پہلے اہل بنو، پھر خواہش کرو) بڑے معنی خیز انداز میں، بار بار، دہراتا جب اس کی صراحت پوچھی جاتی تو کہتا کہ باغ لگانے والے خود پھل نہیں کھاتے، آئندہ نسلیں کھاتی ہیں، یہ سودا اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے، کے طور پہ نہیں ہوتا۔ یہاں کتنے ہیں جو خود پھل کھانے کے لئے نہیں، آئندہ نسلوں کے لیئے، پاکستان کے باغ کی آبیاری کرنے وہاں جا رہے ہیں، یہاں ایک طرح کی اکثریت کا رونا روتے ہیں، وہاں کسی دوسری طرح کی اکثریت کا گلہ کریں گے، اور پھر وہاں سے، بہتر مستقبل کی تلاش میں، لندن، امریکہ، اور جانے کہاں کہاں چلے جائیں گے — کامیابی کا تو ایک ہی راز ہے، محنت، خود اعتمادی، دیانت، اور جذبۂ قربانی — اچھا شہری، اچھا انسان، اچھا مسلمان، یہ سب بننے کا یہی ایک نسخہ ہے، مگر یہ ذائقہ میں ذرا تلخ ہے، حلق کے نیچے آسانی سے نہیں اُترتا — اس کی ان باتوں کو سن کر لوگ، اُس کے منہ پر، اُس کو فلسفی کہتے، اور اُس کے پیچھے اُس کو "خبطی" بتاتے — مگر وہ کبھی مشتعل نہیں ہوتا، اور نہ کسی سے بحث میں اُلجھتا — اُس کی پوشش معمولاً کرتا، اور پاجامہ تھی، طبعاً، ضرورتاً، یا عقیدتاً — مگر لوگ اُس کی اس روش کو، اُس کے سیاسی نظریے کا آئینہ دار سمجھتے۔ اور اُسے نیشنلسٹ کانگریسی

یا کمیونسٹ، خیال کرتے ــــ ملک میں الکشن کا زمانہ قریب آگیا، اور اُسی کے ساتھ وسیم کے ایم' اے کے امتحان کا بھی، اُس کے مستقبل کا سارا دارو مدار اُس امتحان میں اول درجہ حاصل کرنے پہ تھا، اُس نے دسمبر کی بڑے دن کی تعطیل کے ساتھ تین مہینہ کی چھٹی لے لی، اور کہیں باہر جاکر، یکسوئی سے، امتحان کی تیاری کا پروگرام بنایا ــــ وہ چھٹی پہ روانہ ہونے والا ہی تھا کہ اچانک ایک رکاوٹ پیدا ہوگئی ــــ مجلس انتظامیہ کے سکریٹری، فرید احمد، ایڈوکیٹ، کی بہن کی شادی ۲۵ر دسمبر کو قرار پاگئی ــــ فرید احمد سٹی مسلم لیگ کے بڑے سرگرم کارکن تھے، اور وسیم پر ہنٹنلزم کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ سارے مدرسین نے، اس تقریب میں شرکت کے لئے، اس تعطیل میں گھر جانا ملتوی کردیا، اب اس موقع پر صرف وسیم کی غیر حاضری بڑی غلط فہمی پیدا کرسکتی تھی، وہ مجبوراً رک گیا ــــ اس شادی کی نوعیت بھی ذرا غیر معمولی تھی، فرید کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہ تھی، یہی کوئی چالیس، بینتالیس، مگر اُس کی صحت یکبارگی بڑی تیزی سے گرنے لگی، وہ نحیف الجثہ، اور کسی قدر وہمی بھی تھے، یوں بھی قانون دان ضرورت سے زیادہ ہی محتاط ہوتے ہیں ــــ وہ اپنی ماں کی تنہا اولاد تھے، سوتیلی ماں سے کئی لڑکے، اور لڑکیاں تھیں، باپ کے پاس کافی بڑی جایئداد تھی، موروثی بھی، اور خود پیدا کردہ بھی، والد صاحب خاصے زن مرید تھے، فرید کی وکالت، سیاست کے چکر میں، بس واجبی سی تھی، اور بچے زیادہ تھے ــــ اُن کو ڈر ہوا کہ، اگر میں باپ کے سامنے مر گیا، تو میرے بچے محجوب الارث ہوجائیں گے ــــ ایسی صورت میں اُنہوں نے اپنے بچوں کے تحفظ کے لئے، اپنی ایک سوتیلی بہن کی شادی، اپنی بیوی کے بھائی سے کرانی تجویز کی، تاکہ اُس کی عدم موجودگی کی صورت میں، اُس کے وہ بہنوئی، اپنی بہن، اور اُن کے

بچوں کے، اس گھر میں احاطی بن سکیں ـــــ فرید نے یہ تجویز، اپنی بیوی کے ذریعہ، اپنے خسر کے پاس بھیجی، بیٹی تو ہر باپ کی کمزوری ہوتی ہے، انہوں نے اس رائے سے اتفاق کر لیا، اور اعجاز کے لئے اس رشتہ کی تحریک کی اجازت دے دی، اعجاز ایم اے کر چکا تھا، اور اب مقابلہ کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا ـــــ خسر کی اجازت پا کر، فرید نے اس رشتہ کے لئے اپنے یہاں سلسلہ جنبانی شروع کی، سوتیلی ماں نے مخالفت کی، مگر باپ جہاندیدہ تھا، چار کنواری لڑکیوں کے رشتہ کی فکر اس کی نیند حرام کئے ہوئے تھی، لڑکیوں کی عمر بڑھ رہی تھی، بلکہ اب تو چاروں ہی ہم عمر معلوم ہونے لگی تھیں، اور جہیز کے مطالبات سونے کی قیمت کے ساتھ، روز بہ روز چڑھ رہے تھے، اور اس مخصوص رشتہ میں اس طرح کا کوئی سوال نہیں تھا ـــــ انہوں نے بلا تامل بڑی لڑکی ناہید کے لئے یہ رشتہ منظور کر لیا ـــــ بڑی لڑکی کی شادی کا معاملہ یوں بھی بڑا اہم ہوتا ہے، صرف اس کی شادی نہیں کرنا ہوتا، بقیہ کنواری لڑکیوں کے لئے بھی یہ میدان انتخاب، خاص اہتمام سے مرتب کرنا ہوتا ہے، اور یہاں تو سمدھیانے سے بارات آ رہی تھی، بڑی دھوم دھام سے انتظامات ہوئے ـــــ بارات قصبہ سے شہر میں آنی تھی، فاصلہ کوئی پچاس ساٹھ میل تھا، بارات ٹرین سے روانہ ہوئی، اور دولہا کی روانگی اس سجی ہوئی کار میں قرار پائی، جس میں دلہن کو لانا تھا ـــــ بارات مغرب سے قبل لڑکی کے مکان پر پہنچ گئی، دولہا کو سات بجے شام کو وہاں پہنچنا تھا، نو بج گئے، دولہا اب تک نہیں آیا، تو تشویش ہوئی کہ مبادا راستہ میں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو، فرید دریافت حال کے لئے روانہ ہوئے، راستہ میں اُدھر سے آتی ہوئی کار ملی، مگر اس میں دولہا نہیں تھا، معلوم ہوا کہ اعجاز، عین موقع پر کہیں

روپوش ہوگیا، اور اپنے باپ کے نام ایک رقعہ چھوڑ گیا: "مخدومی! میں نے آپ کے ارشاد پر بہت غور کیا، مگر بیٹے کی شادی پر میری طبیعت کسی طرح رجوع نہیں ہوتی ـــ بہن پر، میری زندگی میں، اگر خدانخواستہ کوئی بپتا پڑی تو مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا اُٹھا نہیں رکھوں گا، مگر اِس شادی سے آپ لوگ مجھے بالکل معذور سمجھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" فرید کی ساری "مصلحت" اور "قانون دانی" دھری رہ گئی ـــ وہ مایوسی سے واپس آیا، خاموشی سے اُس رقعہ کو اپنے خسر کو دے دیا، اُن کے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ـــ بیٹی کی سسرال کا نازک معاملہ، سوتیلا رشتہ، بارات دروازے پر لگی ہوئی، باپ موجود، دولہا، عین وقت پر، غائب، ایسی ڈرامائی توہین آمیز مشکل، اُن کے خواب میں بھی کبھی نظر نہیں آئی تھی، ضعیف آدمی، اُن کو تو جیسے سکتہ ہو گیا ـــ حقیقت حال ابھی صرف گھر والوں کے ہی علم میں تھی، مہمانوں سے کہہ رہے تھے کہ نوشہ کے آنے میں، کار کی خرابی کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے ـــ رات کے دس بج گئے، سردی بڑھنے لگی، مہمان بے چین ہو گئے، اس لئے باہر فوراً کھانا کھلانا شروع کر دیا گیا ـــ اور اس دوران میں خاندان کے بزرگ اس غیر معمولی صورت حال سے نپٹنے کی تدبیر سوچنے لگے ـــ شدہ شدہ اس کی سُن گن زنان خانہ میں بھی پہنچ گئی، وہاں تو جیسے بم گر پڑا، گویا دلہن مایوں ہی میں بیوہ ہو گئی ـــ اُس کی ماں اور فرید کی بیوی، دونوں ہی غش کھا کر گر پڑیں، ساری محفل ہائے ہائے کرتی ہوئی اُن کے پاس دوڑی ـــ اِدھر ناہید، سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس، مصالحہ میں بسی، پھولوں میں بسی، ارمانوں سے بھری، ہچکیوں سے، زار و قطار رونے لگی ـــ باہر کھانے پر، کسی مدرس نے، از راہ تفنن، وسیم کو چھیڑا "تم نے

کچھ سنا، دولھا میاں راستہ سے فرار ہوگئے، اندر کہرام مچا ہوا ہے، دلہن پر بے ہوشی کے دورے پہ دورے پڑ رہے ہیں، کیا خیال ہے، اس موقع پر قربانی دو گے......" — "اگر یہ مشکل میری قربانی سے حل ہو سکتی ہے، تو میں حاضر ہوں" — وسیم کے اس جواب پر سب زیر لب مسکرا کر رہ گئے — لوگوں کو شادی کے بارے میں اُس کے خیالات اچھی طرح معلوم تھے، وہ اپنے کتنے ساتھیوں کو شادی کے خلاف مشورہ دے چکا تھا، ایک بار تو اسکول ڈبیٹ میں اُس نے اِس موضوع پر بڑی سیر حاصل تقریر بھی کی تھی، تقسیم انعامات کا جلسہ تھا، اُس موقع پر فریدا احمد بھی موجود تھے، اُس نے اپنی تقریر کے دوران میں، جنس اور پیٹ کی بھوک کا مقابلہ کرتے ہوئے، ایک لطیفہ سنایا — ایک بھوکا نوجوان، چوری کی غرض سے کسی بوڑھے حلوائی کی دوکان میں، رات کو داخل ہوا، اُس کی نوجوان بیوی، شاید کسی یار کے انتظار میں، دروازہ کھولے بیٹھی تھی، اندھیرے میں وہ اُس سے، بے ساختہ لپٹ کر، بوس و کنار کرنے لگی، مگر وہ اُسے پرے جھٹک کر، مٹھائیوں کی ایک تھال لے کر بھاگ گیا — اِس لطیفہ پر بڑا قہقہہ پڑا — اُس نے کہا، یہ بات ہنسنے کی نہیں، سوچنے کی ہے — زمانہ بدل گیا، خاندان اور کفو کی بات ختم ہو گئی، رہی محبت، وہ تو ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

جہیز، اور دختری والی شادی تو گداگری ہے — اب تو پہلے بینک بیلنس اور بیوک کار کا انتظام کیجئے، پھر شادی کی بابت سوچئے — وسیم کے ان خیالات سے واقف لوگوں نے سمجھا وہ یہ بات بہ لطائف الحیل ٹال گیا ہے — مگر پرنسپل نے بھی اِس کا جواب سُن لیا تھا، اُن کے خیال میں

اُس کی سوچ کا انداز، بچپن کے حادثات کی وجہ سے، عام لوگوں سے ضرور مختلف تھا، مگر اُس کے کردار میں کہیں جھول نہیں تھا ——— وہ وسیم سے مخاطب ہوئے "کیا تم واقعی اُس لڑکی کو اِس حال میں قبول کرنے کو تیار ہو؟" ——— "بلاشبہ! اگر اُن کی عزت اس طور پر بچ سکتی ہے، تو میں حاضر ہوں" ——— پرنسپل نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی، اور فرید کے پاس جا کر یہ تجویز پیش کی، فرید کو سخت تعجب ہوا، اُس کے خیالات، اُس کے حالات، اُس کے تعلقات، کے پیش نظر، اُس کی یہ پیش کش، انتہائی حیرت انگیز تھی، مگر یہ "ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا" تھا، اُس نے باپ اور خسر سے اس کا ذکر کیا، ان دونوں نے اِس کو غیبی امداد تصور کیا، اور فوراً راضی ہو گئے ——— اندر اطلاع ہوئی "دولھا آ گیا، مولانا ایجاب وقبول کے لئے اجازت لینے آ رہے ہیں" - یہ خبر بم کا دوسرا دھماکہ ثابت ہوئی، اس کا شور سن کر خواتین، اُس کی ماں کو چھوڑ کر، ایک دم دُلہن کے کمرہ میں، اِس ڈرامے کا کمیڈی سین دیکھنے کے لئے گھس پڑیں ——— وہاں وکیل اور گواہوں کو پہنچنے کے لئے راستہ بنانا مشکل ہو گیا ——— وکیل نے دُلہن سے اجازت لیتے وقت "اعجاز" کی بجائے "وسیم" کا نام لیا تو ناہید یکبارگی چونک پڑی، جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا، اُس کے گرد بیٹھی ہوئی عورتیں، اور قریب کھڑی ہوئی لڑکیاں "اوئی اللہ"، "اوئی اللہ" کہہ کر ایک دوسرے کا منھ تکنے لگیں، ماں ناہید تک پہنچنے کی کوشش میں مجمع میں پھنس کر رہ گئی ——— ایسے موقع پر انسان کے حواس خمسہ بجلی کی سی تیزی سے کام کرتے ہیں، ناہید از خود اِس اچانک تبدیلی کی وجہ سمجھ گئی ——— کون ہے؟ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ یہ اُس نے کچھ نہیں سوچا، اُس کی نگاہ میں بس ایک نوجوان کی لپ تی، اور دوسرے کی بلندی گھوم گئی، جو وقت کے وقت

اُس کی آبرو بچانے کے لئے آگیا ہے —— اُس نے، بلاتوقف "منظور ہے"
بالجبر، اس طور پر کہا گویا یہی وہ شخص ہے جو اُس کی دل کی دنیا میں، اتنے
دنوں سے، بسا ہوا تھا —— رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت کہتے ہوئے
مہمان رخصت ہوگئے —— اب دوسرے روز سارے شہر میں بس وسیم
ہی وسیم کی دھوم تھی، جہاں دیکھو اُسی کا تذکرہ، اُس کو نٹھلا، نکما،
نکھٹو کہنے والے آج اُس کو مبارک باد دے رہے تھے، "این کار از تو
آید و مرداں چنیں کنند" —— اُس کی شادی کا پہلا ہفتہ دن کو لوگوں کی
مبارک باد، اور رات کو ناہید کے آنسوؤں کے موتی بٹورنے میں گذر گیا
—— وہ ناہید کو برابر تسلی دیتا رہا "بی بی! آدمی صورت سے نہیں، کردار
سے پہچانا جاتا ہے، شادی میں اکثر ٹھوکر لگتی ہے، جن کو وقت سے لگ جاتی
ہے، وہ بچ جاتے ہیں، جن کو بعد میں لگتی ہے، وہ ساری عمر روتے ہیں، تمہارے
یہ آنسو اول و آخر ہیں، اب تم انشاء اللہ کبھی نہیں روؤگی، رونا پڑا تو میں
ہی روؤں گا" ——

ملک تقسیم ہوگیا، وسیم بھی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ، ہجرت کے
سیلاب میں بہتا ہوا، پاکستان آگیا —— اُس کے خیال میں، ملکی سیاست
سے دور رہ کر بھی، اُس کے منطقی نتیجہ سے کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا،
اُسے ہندوستان میں اب ناخواندہ مہمان کی شکل میں رہنا پسند نہیں تھا،
اور اب تو بچوں کا کچا ساتھ تھا، اُن کا مستقبل اُس کی بڑی ذمہ داری
تھی، مگر یہاں آکر اُس نے ہجرت کے نام پر کوئی فائدہ اُٹھانے کی کوشش
نہیں کی —— کوئی مکان، کوئی فلیٹ، کوئی پلاٹ، کوئی پرمٹ، کوئی کلیم
حاصل کرنے کا اُس کو خیال بھی نہیں آیا —— وہی مدرسی ذریعہ معاش، وہی کرایہ کا

کا مکان جائے پناہ، جو وہاں، سو یہاں — وہ اپنی بیوی سے بالکل مطمئن تھا، اور بیوی اُس سے انتہائی خوش، مگر شادی والے حادثے، اور ہجرت کی صعوبت نے ناہید کی صحت کو گھن لگا دیا، بچوں کی جلد جلد پیدائش نے اُس کی رہی سہی کمزور صحت کو بالکل تباہ کر دیا — وسیم کی آمدنی محدود تھی، اور اخراجات روز افزوں، ناہید کا معقول علاج نہیں ہو سکا، اُس کی حالت روز بہ روز خراب ہوتی گئی، اور اُس پر جگر کی شکایت نے بڑھ کر اُس نے اک لا علاج شکل اختیار کر لی — اُس کے مکان کے قریب ایک اُستانی رہتی تھی، ناہید کا اور اُس کا بہناپا ہو گیا تھا، وہ اسکول سے واپسی پر اُس کے ہاں روزانہ آتی، اُس کے بچوں کی دیکھ بھال کر دیتی، کبھی کبھی اُس کی ہانڈی بھی سنبھال دیتی، جیسے جیسے ناہید کی حالت خراب ہوتی گئی، اُس کی ہمدردی میں اضافہ ہوتا گیا، عندلیب کی اس بے غرض خدمت نے ناہید کا دل موہ لیا — ناہید کی علالت نے جب طول کھینچا، اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی تو اُس کو وسیم کی بے سر و سامانی کا خیال بری طرح ستانے لگا، وہ دیکھتی کہ وہ صبح روز معمولی سی چائے پی کر کالج کے لیے روانہ ہوتا، اور دو شفٹوں میں کام کر کے، اُس کی دوا وغیرہ لے کر، نو بجے رات کو گھر میں قدم رکھتا ہے — اُس وقت اُس کو اُلٹی سیدھی جو روٹی مل جاتی ہے اُسے کھا کر ایک تھکے ماندے مزدور کی طرح، بجائے فٹ پاتھ، اپنے پلنگ پر، جا کر پڑ رہتا ہے — اور پھر دوسرے روز صبح وہی چکر شروع ہو جاتا ہے، اُس کی زندگی بالکل ایک مشین بن کر رہ گئی ہے — ناہید کا ضمیر اُس کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ جس شوہر نے، اُس کے لئے اتنی بڑی قربانی دی، اور اب بھی اُسی سیر چشمی سے اُس کی اتنی خدمت کر رہا ہے، وہ اُس کے معمولی آرام کے لئے بھی کچھ نہیں کر پاتی — یہ تو بڑی احسان فراموشی ہے —

ایک روز اُس نے عندلیب کو اپنی شادی کی پوری داستان سنائی، اور اُس سے کہا "وسیم آدمی کی شکل میں ایک فرشتہ ہے، ایسے آدمی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے، بس قسمت سے کبھی کبھی کسی کے ہاتھ لگ جاتے ہیں، تم کو آسانی سے ایسا رفیق زندگی نہیں ملے گا، میں بس چند روزہ مہمان ہوں، آج نہیں، تو کل میری شمع زندگی گل ہو جائے گی، میری مانو تو تم، میری زندگی ہی میں، وسیم سے شادی کر لو، جب تک میں زندہ ہوں، ہم تم دونوں، سوت نہیں، بہنیں بن کر رہیں گی ـــ اور جب میں چلی جاؤں گی، تو وسیم اور میرے بچے، تمہاری موجودگی میں، میری کمی محسوس نہیں کریں گے" ـــ عندلیب تو جیسے اُس کے لئے تیار ہی بیٹھی تھی، فوراً راضی ہو گئی ـــ مگر وسیم کو عقد ثانی کے لئے راضی کرنے میں ناہید کو بڑی دقت پیش آئی، اُس نے ناہید کو سمجھایا "کچھ فیصلے عقل سے ہوتے ہیں، اور کچھ جذبات سے، مگر ہر ایک کا اپنا موقع محل ہوتا ہے، میں نے جو تم سے شادی کا فیصلہ کیا تھا، وہ بھی بے شک جذباتی تھا، مگر وہ عقل کی کسوٹی پر بھی ٹھیک تھا، میری ہی نہیں، اوروں کی بھی، مگر تمہارا یہ فیصلہ نرا جذباتی ہے، اور عملی طور پر اُس کی کامیابی مشتبہ ہے" ـــ

مگر ناہید نہ مانی، اُس نے وسیم کی بے حد خوشامدیں کیں، اپنی صحت اور اپنے بچوں کے مستقبل کا واسطہ دیا، عندلیب کی ایک ایک خدمت گنوائی، سمجھایا "اس بھری دنیا میں، اس وقت، کوئی کسی کا نہیں ہے، نفسی نفسی کا عالم ہے، ہم دونوں کے ماں، باپ، بھائی، بہن، کوئی بھی یہاں نہیں ہیں، اور ہوتے بھی تو، ان حالات میں، وہ کے روز ہماری شرکت کرتے، مجھے تو جانتے ہیے، مگر میں تمھیں اس طرح، بے یار و مددگار، ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ، کس طرح چھوڑ کر جاؤں، تم جہاں مجھے زندگی بخشی، وہاں مجھے یہ سکون

موت مرنے دو، ورنہ مجھے قبر میں بھی چین نہ آئے گا" ــــ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، بیوی کے آنسو، پیار کرنے والی، اب دم بیوی کے آنسو، کا مقابلہ وسیم نہ کر سکا، ہتھیار ڈال دیئے ـــــ اور ناہید نے وسیم کی شادی، جی ہاں! یہ دوسری شادی، اپنی زندگی میں، اپنے ہاتھوں سے، ایسی دھوم سے کی، جیسے اپنے شوہر کی نہیں، اپنے بیٹے کی کر رہی ہے ـــــ خود اُس کی اپنی شادی تو ایک ہنگامی شکل میں ہوئی تھی، اُس وقت دعوتِ ولیمہ نہیں ہو سکی تھی، اِس موقع پر "بیگم ناہید وسیم" نے، خود اپنے دستخط سے نوید تقسیم کر کے، نہایت زوردار قسم کی دعوت کی، دوری قریبی عزیز اقارب، دوست احباب، سب کو مدعو کیا، لوگ دعوت سے زیادہ اس عجیب و غریب شادی کا تماشا دیکھنے آئے ـــــ لوگوں نے دولھا دلہن کو دیکھا، اور اِس تقریب کی کرتا دھرتا، بیگم ناہید وسیم کو بھی دیکھا، جو لوگوں سے مبارک باد، اور تحفے وصول کر کے، ان کا شکریہ ادا کر رہی تھیں ـــــ جاتے وقت سارے مہمان، مرد اور عورت، اک زبان ہو کر کہتے گئے "دونوں خبطی ہیں!" ـــــ

یہ اپنی قسم کی نرالی شادی دو سال تک، جوں توں، چلی ــــ وسیم نے توازن قائم رکھنے کی بہت کوشش کی، مگر ایک طرف موت کا سوال تھا، دوسری طرف زندگی کا، ایک کی موت، دوسری کی زندگی، اور ایک کی زندگی، دوسری کی موت ـــــ اس درمیان میں ناہید نہ مری، نہ اچھی ہوئی، یوں موت کے منھ میں کئی بار گئی، اور واپس آ گئی ـــــ عندلیب شاید انتظار کے کشمکش سے اب تھک گئی، اُس نے ایک روز وسیم سے اچانک مطالبہ کیا "آپ ناہید کو طلاق دے دیں" ـــــ وسیم چکرا گیا، اُس نے

عندلیب کو سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کی "حقیقی دنیا، خیالی دنیا کی طرح دل آویز نہیں ہوتی، مگر ذمہ دار انسان ناموافق حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں، یہی زندگی میں خوشی کا راز ہے، خوشی کے پیچھے بھاگنے والے نہ گھر کے ہوتے ہیں، نہ گھاٹ کے ــــ طلاق جائز، مگر بڑی معیوب چیز ہے، عقدِ نکاح دراصل ساری زندگی کی رفاقت کا معاہدہ ہے، مشکل ترین حالات میں بھی اس کو نباہنا انسانیت کا تقاضا ہے، میں تو کبھی اس طرح کی بات سوچ بھی نہیں سکتا ــ خود مجھ سے جو قربانی طلب کرو، میں اس کے لئے حاضر ہوں، مگر ناہید کو قربان کرنا میرے بس کی بات نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ سلسلۂ گفتگو کئی دن، بلکہ کئی ہفتے تک چلتا رہا، اور وسیم عندلیب کو جتنا سمجھاتا، وہ اتنی ہی اپنے مطالبہ میں سخت ہوتی جاتی، حتیٰ کہ ایک روز وہ وسیم پر بالکل پھٹ پڑی "اگر آپ ناہید کو طلاق نہیں دیتے، تو آپ اسی وقت فوراً میری گلو خلاصی کر دیں، ابھی تو میرے پیر میں کوئی بیڑی نہیں ہے، ممکن ہے کل وہ بھی پڑ جائے، آپ کو بیوی نہیں، ماما چاہئیے، وہ بھی دودھ پلانے والی، جو خدمت بھی کرے، اور کما کر، آپ کا، اور آپ کے بچوں کا پیٹ بھی بھرے ــ یہ چیز میرے بس کی نہیں ہے ــ میں نے اپنا دین مہر معاف کیا، یہ لیجئے کاغذ اور قلم، اور مجھے فارغ خطی عنایت کیجئے" ــــ دودھ پلانے والا طعنہ اپنا کام کر گیا ــ وسیم نے طلاق نامہ پر دستخط کر کے عندلیب کو تھما دیا، اور وہ جس پھرتی سے آئی تھی، اسی رفتار سے، یہ جا، وہ جا، نظروں سے غائب ہو گئی، بس وہ خواب تھا جو کچھ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔ وسیم اور ناہید خلا میں گھورتے رہ گئے، اور پھر پتہ نہیں چلا وہ کہاں گئی ــ اور چند ہی ہفتوں کے بعد ناہید بھی قضا کر گئی، کچھ تو عارضہ کی شدت، اور زیادہ اس حادثہ کی چوٹ نے اس کا کام تمام کر دیا ــ اس موقع پر وسیم کے پاس تعزیت کے لئے آنے والے پھر بھی کہتے گئے ــــ "خبطی ہے، نرا خبطی!"

خزانۂ دل کا چور

حافظ، نہ حافظ تھا نہ نابینا، ایک خستہ حال شاعر کا لڑکا تھا، جو حافظ تخلص کرتا تھا، اور اس کو شکم مادر میں چھوڑ کر مر گیا تھا، غم زدہ بیوہ، شوہر کی یاد میں بیٹے کو حافظ پکارنے لگی، اور پھر یہ نام، اس کے مقدر کی طرح، اس سے چپک کر رہ گیا — دو برس کا ہوا تو ماں بھی، اسے چھوڑ کر اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ دولت کو ستار عیوب، اور قاضی الحاجات کہتے ہیں، یہی حال عزت کا بھی ہے، کچھ کو بگاڑ دیتی ہے، کچھ کو سنوار دیتی ہے۔ حافظ کی طبیعت پڑھنے کی طرف رجوع ہو گئی اور اس کو ایک ہم مذاق ہم سبق مجید مل گیا۔ باپ تو اس کا بھی مر گیا تھا مگر ماں زندہ تھی اور معاشی فراغت تھی۔ ان دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ حافظ کی بوڑھی خالہ اس کو ماں کی محبت دینے کی کوشش کرتی، اور اپنا پیٹ کاٹ کر روٹی بھی۔ — مگر صورت شکل، جسم و قوت، روٹی کی محتاج نہیں ہوتی، یہ اللہ کی دین ہے، جسے پروردگار دے، عنفوان شباب میں، حافظ بڑا سجیلا جوان نکلا۔ پڑھائی میں تو اچھا تھا ہی، کھیل میں بھی کسی طور پر اچھی مہارت پیدا کر لی، اس سے اس کو اپنی تعلیم جاری رکھنے میں بڑی مدد ملی۔ اسکول فیس معاف ہو گئی، اسکول کے کوآپریٹو اسٹور سے کتابیں اور کاپیاں فری ملنے لگیں اور گیم فنڈ سے اسٹور انچارج کے طور پر کچھ ماہوار الاؤنس بھی مقرر ہو گیا۔

حافظ تو پڑھنے کے لئے کھیلتا تھا، مگر اس کی ٹیم کے دو ساتھی زاہد اور احمد علی کھیلنے کیلئے پڑھتے تھے، کند ہم جنس باہم جنس پرواز، یہ دونوں طبیعت کے بڑے منچلے تھے۔ محرم کے موقع پر، ایک جگہ زنجیر کا ماتم ہو رہا تھا، یہ دونوں بھی اس میں شریک تھے،

ان کے ٹھیک سامنے ایک بڑی اونچی کسی بڑے رئیس کی پختہ قبر تھی، چار قبروں کے برابر ایک، شاید اس میں مرحوم کی ایک سے زائد بیویاں آرام کر رہی تھیں۔ رئیسوں کے حرم تو سفر میں بھی ساتھ رہتے ہیں، خواہ وہ سفرِ آخرت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر آج اس قبر پر کچھ طوائفیں کھڑی ہوئی یہ ماتم دیکھ رہی تھیں، اس میں ایک نوخیز بلا کی حسین طوائف ناصری سے

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن   جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن

سنگِ مرمر کی مورتی جیسی سیاہ جارجٹ کی ساڑھی میں، حزن و ملال کی تصویر بنی، دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ ان دونوں دیوانوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اپنی سینہ کوبی شروع کر دی۔ جیسے قصائی اپنی مڈھی پر گوشت کا قیمہ کوٹ رہا ہو، زائر کا سینہ چھلنی ہو گیا، خون کا فوارہ ابلنے لگا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حافظ نے لپک کر اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور میڈیکل کیمپ میں پہنچا دیا۔ پھر احمد علی کے ساتھ بھی یہی ہوا اور اس کو بھی حافظ نے ہی وہاں سے منتقل کیا۔ ناصری یہ سین ایک تاثر کے ساتھ دیکھتی رہی۔

محرم ختم ہو گیا تو زائر اور احمد علی کو اس پری وش کی زیارت کا شوق بے تاب کرنے لگا، ذریعہ کی تلاش ہوئی۔ معلوم ہوا کہ حافظ وہاں پر بھی ان کو اپنے کاندھوں پر پہنچا سکتا ہے۔ اتفاق سے ناصری کی ماں، حافظ کے خالو کے بھائی کی داشتہ تھی، اور اس رشتہ سے ناصری بھی اس کی کچھ لگتی تھی، شرعی نہیں عرفی سہی، اور کون جانے شرعی بھی ہو، یہ راز تو صرف اللہ ہی کے علم میں ہوتے ہیں ___ ان دونوں نے حافظ کو بہت گھیرا، وہ مجبوراً یہ غلطی کر بیٹھا۔ اب زائر اور احمد علی وہاں روزانہ پھیرے ڈالنے لگے، کتابیں طاق پر رکھ دی گئیں۔ اسکول سے مستقل غیر حاضریاں ہونے لگیں۔ بس کرکٹ کا میدان اور ناصری کا کوٹھا ان دونوں کی جولان گاہ بن کر رہ گیا ___ رات کو وہاں رئیسوں کے لئے رقص و سرود کی محفل جمتی اور دن کو یہ لوگ ناصری کے مکتب میں تاش کا سبق پڑھتے، اتوار کے اتوار حافظ بھی چوتھے پارٹنر کے طور پر اس پارٹی میں شریک ہو جاتا۔ مگر اس کے حصہ میں بس دو ہی

کا جلوہ رہتا۔ شریف کی لڑکی اور طوائف کی لڑکی میں شیشے اور تانبے کے برتن کا فرق ہے، ایک میں ذرا بال پڑا اور ختم! اور دوسرے پر جب قلعی کرادی، نئے کا نیا۔ پھر طوائف کی لڑکی "لڑکی" تو نہیں ہوتی، وہ تو کنبہ کی روزی کا ذریعہ ہوتی ہے۔" ناصری ابھی کلی تھی، اب اس کے پھول بننے کا وقت آگیا۔ اس کے لئے اس کی جہاندیدہ ماں، زردار گل چیں تلاش کر رہی تھی۔ اس نے ان لونڈوں کی گانٹھ ٹٹول کر ایک روز کھل کر کہا۔ "بیٹے! یہ رنڈی کا کوٹھا ہے، کلب نہیں۔ یہاں تاش کی نہیں، ناچ گانے کی محفل جمتی ہے، اس کی سنگت کرنے والوں کو روزینہ دینا پڑتا ہے۔ میں ناصری کے ساتھ فاقہ کر بھی لوں تو ان لوگوں کو کیا جواب دوں۔ یہ ظالم پیٹ بڑی بلا ہے، اس کو بھرنے کے لئے سب ہی کچھ بیچنا پڑتا ہے۔ علم، ہنر، عزت اور عصمت کوئی کوٹھے پر بیچتا ہے، کوئی کلب میں بیچتا ہے، کوئی چھپ کر بیچتا ہے، کوئی بالا علان بیچتا ہے۔ ہم دن دہاڑے بے پردہ آتے جاتے ہیں مگر ہمارے شریف گاہک رات کی تاریکی میں بھی پردہ پوش آتے ہیں اور ذرا سے کھٹکے پر دبے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور ہماری روزی بھی اپنے ساتھ واپس لے جاتے ہیں۔ ہماری تو اتفاقی چھٹی کے بھی دام کٹ جاتے ہیں، اس پر کوئی لیبر قانون لاگو نہیں ہوتا۔ بیٹے! برا نہ ماننا، مفت تو بیوی ملتی ہے، رنڈی نہیں"۔۔۔ بات صاف سچی اور کھری تھی، ان دونوں کی سمجھ میں آگئی۔ مگر یہ بچاری اس دیوی کا چرن چھوڑ کر جانے والوں میں نہیں تھے۔ یہاں تو ان کی یہ صورت ہوگئی تھی کہ ؎

بیٹھے ہیں ترے در پہ تو کچھ کر کے اٹھیں گے

احمد علی نے اپنی ماں کی چھپی ہوئی پوٹلیاں غائب کرنا شروع کر دیں اور زائر نے ایک ہی ہلہ میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی کے کل زیورات پر ہاتھ صاف کر دیا۔۔۔ مگر اس کے عوض ناصری کے صرف لب و رخسار تک ہی رسائی ہو سکی، اور یہ رسائی کمبخت دو آتشہ ثابت ہوئی ان کا سارا وجود بھڑک اٹھا۔ ادھر حافظ ایک روز اپنے خالو کا ایک خط لے کر ناصری کے عرفی باپ کے پاس گیا۔۔۔ بغل والے کمرہ میں استادجی ناصری کو تعلیم دے رہے تھے،

اور وہ لہک لہک کر گا رہی تھی ــــ "سجنیا بھئی سولہ برس کی، انگیا کے بند ٹوٹے"
عین اسی وقت ناصری کی نگاہ حافظ سے چار ہو گئی اور وہ جھینپ کر مسکرادی ــــ
دوسرے روز جب وہ خط کا جواب لینے گیا تو ناصری نے اسے زینے میں آلیا اور اس کو اس
بے تحاشہ طور پر اپنے سینے سے دبوچا کہ حافظ نے محسوس کیا جیسے اس کے سینے میں دو میخیں
چبھ گئیں ــــ وہ ہفتوں اپنے سینہ کو بار بار یوں سہلاتا رہا جیسے اس کو ضیق النفس کی
تکلیف ہو گئی ہے۔ مگر وہ ایاز قدر خود بشناس کے رمز سے واقف تھا، اپنے دل پر جبر
کر کے صبر کر بیٹھا۔ اور پھر اس باغ رضواں میں دوبارہ قدم نہ رکھا۔

زائر اور احمد علی کی آنکھ مچولی جاری رہی، دونوں کے مکانوں میں نذرانے
کے سوتے اب خشک ہو گئے اور ادھر زائر کی بے تابئ دل ضبط کی حد توڑ گئی۔ اس نے
ناصری کو "ایک رات کی رانی" بنانے کی ٹھان لی۔ مگر اس کے لئے ایک عدد بنارسی ساڑی اور
ایک سونے کے گلوبند کی فرمائش ہوئی ــــ وہ بھی صرف ایک ہلکی سی کورٹ شپ کے لئے
جی ہاں! وہی کورٹ شپ جسے شادی کا ریہرسل کہتے ہیں۔ اور جس کا رواج اب مشرق میں
بھی شروع ہو گیا ہے۔ ناصری کے حواس پر تو شباب کی سرمستیاں غالب آسکتی تھیں، مگر
بڑی بی کا شباب تو کب کا کافور ہو چکا تھا، وہاں تو اب بس حواس ہی حواس تھا، اور یہ
حواس بھی کہ کسی روز یہ سونے کی چڑیا خود اپنا حواس نہ کھو بیٹھے۔ اندھے کو بڑی دور کی
سوجھتی ہے، اسی طرح تہی دست عاشق کو بھی۔ اس مرحلہ کو سر کرنے کے لئے زائر نے اپنے
سر کی بازی لگا دی وہ صبح سویرے اٹھا، اور سیدھا اپنے باپ کے گاؤں پہنچا، زار و قطار
رو کر کارندے سے کہا "ابا میاں رات ہیضہ میں قضا کر گئے (ابھی حرکت قلب بند ہونے کا
عارضہ عام نہیں ہوا تھا) تجہیز و تکفین کے لئے روپے کی سخت ضرورت ہے" کارندے
نے فوراً مالگذاری سرکار کی کل رقم نکال کر زائر کو دے دی۔ یہ خوش خوش واپس آیا،
ایک طرحدار، سرخ بنارسی ساڑی خریدی اور ایک ذرا ہلکے قسم کا سونے کا گلوبند، اور یہ
ہتھیار حوالے کر دیوی کے منہ پر پہنچ گیا۔ مگر "تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ" اتفاقاً وہی

چار گھنٹے کے بعد میر صاحب خود، تسبیح گھماتے، اپنے گاؤں پر، مالگذاری کی رقم لینے، پہنچ گئے۔ کارندہ اُن کو زندہ دیکھ کر سٹپٹا گیا، میر صاحب نے اُس کے گھبرانے کی وجہ پوچھی، اُس نے زائر کے آنے، اُن کی موت کی اطلاع دے کر، مالگذاری کی ساری رقم لے جانے کی رُوداد، پوری کی پوری سنادی۔ میر صاحب کے پیر تلے سے زمین نکل گئی، وہ بدحواس، افتاں وخیزاں اسکول پہنچے، وہاں وہ پنچھی کہاں، البتہ حافظ پکڑا گیا، ہیڈ ماسٹر نے جو اس کو ایک ڈانٹ پلائی تو اُس نے سب کچھ اُگل دیا۔ میر صاحب نے ناظری کی طرف نگاہ پر چھاپا مارا۔

احمد علی، اپنے نمبر کے انتظار میں، پہرہ دے رہا تھا، وہ دن دہاڑے، علیق ہوئی سڑک پر، کوٹھے کی کھڑکی سے کود کر، بھاگ نکلا۔ بیچارا زائر، حجلۂ عروسی میں، ابھی ابتدائی مراحل طے نہیں کر پایا تھا، کہ میر صاحب بلائے ناگہانی کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑے ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند | دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام، رہ گیا۔

وہ بھی کیا زمانہ تھا، خاندانی رئیس ڈگری وگری نہیں پوچھتے تھے، نہ علمی معائنہ کے قائل تھے، اُن کو اپنی کنواریوں کے لئے بس ایک شکاری کا نوجوان چاہیئے تھا، جو اُن کے ارمانوں کی جھولی بھر سکے، وہ جوانی کا سودا جوانی سے کرنا پسند کرتے تھے، وہ جانتے تھے جہاں جوانی ہوتی ہے، وہاں پیسہ نہیں ہوتا، اور جہاں پیسہ ہوتا ہے، وہاں جوانی نہیں ہوتی، اُس مرد کی جوانی تو پیسہ اکٹھا کرنے میں بیت جاتی ہے۔ اور پھر لڑکی کو کوٹھی، اور کار سے، بلکہ کار کے ڈرائیور سے بیاہنا پڑتا ہے۔ یُوں اُن دنوں بھی، کچھ ہڈیوں کے دیوانے (جیسے آج کل پیسوں کے دیوانے) اپنی جوان بیٹیوں کی بوٹیاں گِدھوں سے نچواتے تھے۔ اُن میں سے کچھ، اپنی قسمت کو رو پیٹ کر، صبر کر لیتی تھیں، کچھ گھر ہی میں، خاموشی سے، اپنی تشنگی بجھانے کا، متبادل انتظام، کر لیتی تھیں۔ زیادہ جرأت مند، بے دھڑک، اپنے باپ، اور اُن کے ہم عمر شوہر، دونوں کی ناکیں کٹوا کر، اُن کے ہاتھوں میں رکھ دیتی تھیں۔ شکاری کتے، اور نوجوان مرد یکساں ہوتے ہیں، اُن کو ایک بار شکار کے خون کا

ذائقہ مل گیا، تو پھر اُن کو جہاں کوئی شکار نظر آیا، وہ بے دھڑک اُس پر جھپٹ پڑتے ہیں خواہ وہ پالتو ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں کتے کے مالک کی گردن ناپی جاتی ہے، زائر اور احمد علی کے باپ، ان معرکوں میں، اپنی گردن نپوانے کے لئے تیار نہیں تھے، اس لئے انہوں نے فوراً ان دونوں کے لیے مستقل شکارگاہ مہیا کردی۔ اب نہ چوری کا خوف، نہ فرمائش کا سوال، نہ دن کی قید، نہ رات کی پابندی، بس اپنی خلوت میں بیٹھے ہیں ہم تصور جاناں کئے ہوئے۔ ابھی تو ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات کا مزا لوٹا جا رہا تھا کہ ایک روز معلوم ہوا کہ ایک نئے مہمان کی آمد آمد ہے۔ اور ناصری ایک خوش آئند خواب کی طرح بھول بھلا گئی ۔۔

اس دوران میں مجید کی بھی منگنی ہوگئی، بس ایک حافظ کی تقدیر ابھی سوتی ہوئی تھی کہ اس کی کھوج کرنے والی ضعیف خالہ پر فالج گر پڑا، اُس رات حافظ مجید کے ساتھ تھیٹر دیکھ کر واپس آیا تھا، اُس کا ہاتھ بالکل خالی تھا، وہ اُلٹے پیر بھاگا ہوا مجید کے پاس گیا، اُس کی آنکھ ابھی لگی تھی، حافظ کی آہٹ پا کر جاگ پڑا، وجہ پوچھی، جیب ٹٹولی، اُس میں پانچ روپے تھے، اُس نے فوراً چار حافظ کو دے دیئے، اور ایک روپیہ آج رات کو آخری شو دیکھنے کے لئے اپنے کوٹ کی، اندر کی جیب میں، احتیاط سے رکھکر، اور حافظ کو شام کو آنے کی ہدایت کر کے، وہ پھر سو گیا۔ حافظ شام کو وقت مقررہ پر پہنچ گیا، یہ دونوں جلدی جلدی، تیار ہو کر تھیٹر پہنچے ۔۔ آغا حشر کی گشتی کمپنی کا، اس شہر میں، یہ آخری کھیل تھا، "یہودی کی لڑکی"۔ اس میں حشر کے چھوٹے بھائی، آغا محمود، اپنے وقت کے بے مثل ایکٹر خود یہودی کا پارٹ کرنے والے تھے۔ پبلک کا بڑا رش تھا، ٹکٹ ملنا دشوار ہو رہا تھا۔ مجید نے ٹکٹ لینے کے لئے جیب سے روپیہ نکالنا چاہا، وہ ندارد، دونوں دوڑے ہوئے گھر واپس آئے، کمرے کا کونا کونا چھان مارا، مگر جیسے اُس روپیہ کو زمین کھا گئی، پختہ زمین، وہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس "یہودی کی لڑکی" کو نہ دیکھ کر مجید کے دل پر ایسی ہی چوٹ پڑی جیسی

ناھری کے وصل سے "عین موقع پر محروم ہو کر، ذاکر کے دل پر پڑی تھی، مجید تو شاید یہ چوٹ دو چار روز میں بھول گیا، مگر حافظ جب بھی وہاں آتا اُس کی آنکھیں، بار بار کمرہ کے مختلف گوشوں میں جیسے کچھ ڈھونڈتی رہتیں — یہ واقعہ مارچ کا تھا، گرمی آئی، برسات آئی، پھر جاڑا آگیا — دسمبر کے مہینے میں آج پھر مجید اور حافظ کوئی نو بجے رات کو، ایک مشاعرے میں جا رہے تھے، آل انڈیا قسم کا مشاعرہ تھا، ساری رات کا پروگرام تھا، گلابی سردی شروع ہو گئی تھی، مجید کی ماں نے وہ کوٹ، بکس سے نکال کر، مجید کو دیا، اُس نے اُس کی تہہ کھولی" اور شکن دور کرنے کے لئے، اُسے زور سے جھٹکا، اور ایکدم "ہائے!" کر کے اپنا گھٹنا تھام لیا۔ حافظ نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا؟" — اُسے خوف ہوا شاید اُس میں بچھو رہا ہو" اُس نے کوٹ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، وہاں کچھ بھی نہیں ملا، تو اُس نے خود بھی اُس کو جھٹکا، اُس کے ساتھ بھی وہی ہوا، تو اُس نے کوٹ کے استر کو اچھی طرح ٹٹولا، معلوم ہوا دامن کے کونے میں کوئی گول سی چیز اٹکی ہوئی ہے، مگر پورا کوٹ استر سے بند تھا، صرف آستین کے مونڈھے کے پاس، جیب کے قریب، کوئی ایک انچ اتنی موٹی سلائی نظر آئی، اُس کو بلیڈ سے کاٹا گیا، اور اُس راستہ سے، بڑی دقت سے، جارج پنجم کی چھاپ کا ایک روپیہ نکلا۔ خیال ہوا، یہ کون سا روپیہ ہے، اور وہاں کیسے پہنچا — مجید کی ماں نے بتایا کہ، جیب کے پاس، آستین کے استر کی سیون کچھ ادھڑی ہوئی تھی، سردی ختم ہونے پر، کوٹ کو بکس میں رکھتے وقت اُس نے اُس کی مرمت کر دی تھی — مجید ایک دم زور سے ہنسا "اچھا! یہ کھیرو والا روپیہ ہے!" — یہ سننا تھا کہ حافظ فوراً چکرا کر گر پڑا، بڑی دیر کے بعد ہوش آیا، مگر حواس غائب، وہ چیخنے لگا "میں چور ہوں، چور — ایک روپیہ کا چور — میں چور ہوں چور — ایک روپیہ کا چور . . . . ." اُس کا دماغی توازن پلٹ گیا، اُس پر خواب و خور حرام ہو گیا، ایک ہفتہ اسی حالت میں گذر گیا، اور دن رات اُس کی یہ رٹ جاری رہی — ناھری کو خبر ہوئی — اب وہ رقاصہ سے شہر کی مشہور ترین طوائف بن گئی تھی، ضلع کے نگین مزاج سپرنٹنڈنٹ پولیس

مسٹر آغا کی منظورِ نظر تھی۔ وہ حافظ کی عیادت کو آئی، پردہ دار بیویاں وہاں سے ہٹ گئیں،
اُس زمانہ میں طوائفوں سے، نامحرم مردوں کی طرح پردا کیا جاتا تھا ــــ ناہری کو دیکھتے
ہی حافظ نے اپنی رٹ شروع کردی "میں چور ہوں، چور۔ ایک روپیہ کا چور......"
ناہری یہ سُن کر مسکرائی، تخلیہ پا کر اُس کے قریب گئی، اور سرگوشی میں، اُس کے کان میں کہا
"تم چور تو ضرور ہو، مگر ایک روپیہ کے نہیں، میرے خزانہ دل کے چور!" یہ محض ایک
فقرہ تھا، یا تریاق کی بوند، یا ایک برقی شاک ــ حافظ دفعتاً خاموش ہو گیا، کوئی ایک
منٹ تک ناہری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کو گھورتا رہا ــ اور پھر ایک دم ہنس
پڑا ــ اُس کی وہ رٹ غائب ہو گئی ــ اور ایک ہفتہ میں وہ بالکل نارمل ہو گیا ــــ
ناہری نے آغا صاحب سے سفارش کر کے اُس کو پولیس سب انسپکٹری کے لئے نامزد کرا دیا،
پولیس ٹریننگ اسکول سے واپس آکر وہ اسی ضلع میں تھانیدار لگ گیا ــ آغا صاحب اس
دوران میں ضلع غیر تبدیل ہو گئے ــ اور ناہری نے اپنا کوٹھا چھوڑ کر، حافظ سے نکاح کر لیا۔
اور وہ اپنے عرفی انکل، اور حافظ کے حقیقی خالو، کے گھر میں بہو بن کر آ گئی ــ اور قبل
اس کے کہ کوئی دوسرا اعتراض کرتا، ناہری کے مکان میں داخلہ کے وقت، حافظ نے خود ہی یہ مصرعہ
پڑھا کہ ــ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا" ــ

حسن طلب

جنگ عظیم دوم چھڑتے ہی، سارے ہندوستان میں، رنگروٹوں کی بھرتی، کا ایک طوفان امنڈ پڑا، کانگرس چیختی چلاتی رہی، مگر اقتدار کے پجاری، زمیندار، اپنے اپنے گاؤں، اور نواح سے، رنگروٹ بھرتی کرانے میں، ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے۔ محبوب کے باپ خالق کی کارکردگی، اس سلسلہ میں بہت ہی نمایاں تھی، ڈپٹی کمشنر نے، اعتراف خدمت کے طور پر، ان کا نام، خان بہادری کے خطاب کے لئے، گورنمنٹ میں بھیجدیا، ابھی اس کی منظوری نہیں آئی تھی، کہ خالق، قضائے الٰہی سے، اپنے خالق حقیقی سے، تہی دست، جا ملے۔ مگر انگریز کے پاس، برا بھلا ایک کردار تھا، وہ اپنے خدمت گاروں کی خدمت، ان کی لاش کے ساتھ دفن نہیں کر دیتا تھا، ان کے ورثا کو ڈھونڈ کر اس کا معاوضہ دیتا تھا، ممکن ہے اس میں اس کی شرافت نفس کو دخل کم، اور اس کی حکمت عملی کو زیادہ ہو، مگر ان کی "سند خدمت" ان کے دور اقتدار میں، پشتوں تک کچھ نہ کچھ کام دیتی تھی۔ اور یہاں تو بالکل تازہ، پہلی ہی پشت کا معاملہ تھا، خالق کے سینہ پر تو "خان بہادری" کا تمغہ نہیں لٹک سکا، مگر بیٹے کو بی اے پاس کرتے ہی نائب تحصیلداری مل گئی ——

آنچہ پدر نہ تواند پسر تمام کند۔ محبوب نے سرکاری عہدہ سنبھالتے ہی بھرتی کی مہم میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ، لڑائی ختم ہوتے ہوتے، نائب تحصیلداری، اور تحصیلداری کا زینہ طے کر کے، ڈپٹی کلکٹر ہو گیا۔ ایک کھاتے پیتے زمیندار کا لڑکا، خاصا سجیلا نوجوان، اعلیٰ عہدہ پر فائز، خاندان،

او بیرون خاندان کے، اچھے اچھے رشتے لے کر لوگ اُس کے گرد، شہد کی مکھی کی طرح منڈلانے لگے۔ مگر صاحبزادے، اپنی کامیابی کے زعم میں، خاندان والوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اُن کا مطالبہ تھا کہ لڑکی یا تو کسی بہت بڑے سرکاری افسر کی بیٹی ہو، ورنہ چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہو۔ کوئی بڑے افسر کی لڑکی تو ملی نہیں، البتہ ایک متوسط خاندان کی "ماہ سلطان" نے اُن کے خانہ دل کو روشن کر دیا۔ دو سال نہیں گذرے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ اور محبوب لٹ لٹا کر پاکستان آ گیا۔ تقدیر کا دھنی تھا، یہاں پہنچا تو وہی انگریز ڈپٹی کمشنر، ایک ہوائی کمپنی کا جنرل منیجر لگا ہوا تھا، اُس کو محبوب نے اُس کی دستخط شدہ، اپنی سند پیش کی، اور فوراً اُس کمپنی میں، ایک اچھے عہدہ پر، مامور ہو گیا۔ اور اُس کے دن، بگڑتے بگڑتے، پھر بن گئے۔ یہاں آ کر اُس کو اپنے، اور اپنی بیوی کے، بہت سے دوری، قریبی عزیز، جو یہاں، مختلف اضلاع میں، بکھرے ہوئے تھے، مل گئے۔ وہ شام کو جب دفتر سے لوٹتا، تو اکثر، کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا، رشتہ دار، اُس کو اپنے بنگلہ میں دھرا ہوا ملتا۔ یوں بھی بے وقت میں، اصلی، نقلی، وصلی، قسم کے رشتہ دار، برسات میں خودرو پودوں کی طرح، اُگ آتے ہیں۔ خیر، ایک روز جو وہ گھر میں آیا تو اُس نے، اپنی بیوی کے پاس، ایک اور چاند بھی طلوع ہوا دیکھا۔ پوچھا "آپ کی تعریف؟"۔ ماہ نے کہا "یہ میری پھوپھی زاد بہن ہیں، کوکب، یہ بیاہ کر دکن چلی گئی تھیں، ہجرت کے سیلاب میں، اپنی چھوٹی بیوہ بہن دردانہ کے ساتھ، بہتی ہوئی یہاں آ گئی ہیں"۔ محبوب کوکب سے مخاطب ہوا "آپ سے مل کر اور آپ کو دیکھ کر، بڑی خوشی ہوئی، مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ ماہ سے بڑی ہیں، یا چھوٹی ہیں"۔ ماہ فوراً بول پڑی "کوکب باجی مجھ سے بہت بڑی ہیں، بلکہ میں تو دردانہ سے بھی کچھ چھوٹی ہوں"۔ عورت کو اپنی کم عمری کا خبط ہوتا ہے، سب سے زیادہ خوشی اُس کو اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی اُس کو، اُس کی بیٹی کی بڑی بہن بتا دے۔ "ماہ ٹھیک کہتی ہیں" کوکب نے تصدیق کی۔ "مگر دیکھنے میں تو آپ ان سے بہت چھوٹی معلوم ہوتی ہیں، اور میں تو انگریزی کے

اس مقولہ کا قائل ہوں کہ عورت کی عمر وہی ہے، جو اس کے چہرے سے معلوم ہو۔" محبوب نے مسکرا کر کوکب کے سراپا کی تعریف کی۔ ماہ نے دوبارہ اپنے پندار کے مدافعت کی کوشش کی "ان کی عمر کم یوں معلوم ہوتی ہے کہ شادی کے آٹھ سال بعد بھی، ان کے یہاں کوئی بچہ نہیں ہوا، اور میرے یہاں تیسرے سال ہی، ماشاءاللہ دوسرا بچہ ہونے والا ہے۔" محبوب نے کوکب سے پوچھا "کیا آپ کو بچوں کا شوق نہیں ہے؟" — "کس بیاہتا کو بچوں کی خواہش نہیں ہوتی!" — "تو پھر اتنی تاخیر کیوں؟" — "بس اللہ کی مرضی!" — محبوب کو جانے کیوں وجہ جاننے کی خواہش ہوئی — "آپ نے کبھی کسی ماہر امراض نسوانی سے بھی مشورہ کیا؟" — "اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی" کوکب کا مختصر جواب تھا — ماہ عقل کے معاملہ میں ذرا پیدل تھی، بیچ میں بول پڑی "صادق بھائی کی یہ چوتھی شادی ہے" — "کیا پہلی تین بیویوں سے بھی کوئی بچہ نہیں ہوا تھا؟" محبوب نے قدرتاً وضاحت چاہی — "جی نہیں" کوکب نے افسردگی سے جواب دیا — "تو پھر یہ بات تو سوچنے کی ہے!" محبوب نے ہمدردی کے انداز میں کہا — "سوچنے کی نہیں، صبر کرنے کی ہے!" کوکب نے معنی خیز جواب دیکر موضوعِ سخن اچانک بدلنے کی کوشش کی "مگر آپ مجھے بار بار "آپ" کیوں کہتے ہیں؟" — "پھر کیا کہوں؟" محبوب نے پوچھا "میں تم کو ماہ کے رشتے کے ناطے "تم" کہوں گی، اور تم اپنے مقولہ کے مطابق مجھکو "تم" کہوگے" "یہ تو آپ نہیں! نہیں!" "تم" نے تو میرے دل کی بات کہدی" — اس سوال و جواب پر ماہ، کوکب اور محبوب تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے — ماہ کے بچہ کی پیدائش کے سلسلہ میں، کوکب، اور اُس کی چھوٹی بہن دردانہ، کوئی ایک مہینہ تک محبوب کے یہاں مقیم رہیں — اس موقع پر دونوں بہنوں نے، بڑی خوبی سے، محبوب کے گھر کو سنبھالا۔ دردانہ ماہ اور اس کے نوزائیدہ بچے کی دیکھ بھال کرتی" اور کوکب محبوب، اور اُس کے دو سالہ بچے کی خدمت کا پورا پورا حق ادا کرتی — اسی دوران میں، اندرون سندھ سے، اطلاع آئی کہ صادق پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔ کوکب

فوراً شوہر کے یہاں روانہ ہو گئی، مگر اُس کے وہاں پہنچنے سے پہلے، صادق اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گیا — یہ خبر سُن کر محبوب دردانہ کو لے کر وہاں گیا، اُس کو تسلی و تشفی دی — اور ایام عدت کے اختتام پر، اُس کی زمین کا معقول بندوبست کر کے، دونوں بیوہ بہنوں کو اپنے ساتھ کراچی لایا — دردانہ کا پہلا بچہ دکن میں پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا، اور دوسرا حمل، ہنگامہ میں شوہر کے قتل کے صدمہ سے، ساقط ہو گیا تھا — صادق اُس کے بہنوئی بھی تھے، اور تایا سسر بھی، اُن کے بھی اُٹھ جانے کے بعد، اِس مہاجرت کے عالم میں، کوکب کو دُردانہ کی دوسری شادی کی فکر ہوئی — مگر وہ دونوں بیوہ بہنیں شاید، اِس گھر میں بھی، موت کا سایہ اپنے ساتھ لائی تھیں — مشکل سے دو مہینے گذرے ہوں گے کہ ماہ کے ایک پستان میں کینسر ہو گیا، اور وہ چار ماہ میں چٹ پٹ ہو گئی — دو تین مہینے تک، اس گھر میں، گورستان جیسا بھیانک سناٹا رہا۔ مگر وہی ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

وقت بڑا مرہم ہے — دونوں بچوں کے دم سے زندگی پھر گھر میں عود کرنے لگی — اور کوکب نے ایک روز، مناسب موقع دیکھ کر، محبوب سے، دبی زبان سے، کہا "اگر تم بُرا نہ مانو، اور میری خود غرضی نہ سمجھو تو میں کہوں گی کہ، ماہ تو اب نہیں آتی، تم کب تک اپنی زندگی اُجاڑ رکھو گے — میں تمہارے دونوں بچوں کو پال لوں گی" — تم دردانہ سے نکاح کر لو، وہ صرف نام کی بیوہ ہے، ماہ اور اُس کی عمر میں، صرف دو ماہ کا فرق تھا، صورت شکل میں اُس کو ہم دونوں پر فوقیت ہے، وہ آج بھی ؎

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ہجرت کی ستم رسیدہ ایک بیوہ سے نکاح کر کے تم کو بے حد ذہنی سکون، اور بڑا ثواب ملے گا" ـــــ کوکب یہ سب کچھ ایک سانس میں کہہ گئی ـــــ "مجھے تمہارا حکم منظور ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ میں خود تم سے نکاح کر وں گا، اور تمہاری خواہش کے مطابق دردانہ کا نکاح اپنے سے کسی بہتر آدمی سے پہلے کر دوں گا۔" محبوب نے بلا تامل کوکب کو جواب دیا۔ مگر کوکب نے کہا۔ "تم کو مجھ سے شادی کر کے بڑی مایوسی ہوگی۔ میرے جذبات بالکل مردہ ہو چکے ہیں۔ میں اندر سے ایک برف کے تودے کی طرح سرد ہوں۔ تم یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔" ـــــ

"جو کچھ بھی ہو، میں تو شادی تم سے ہی کروں گا، ورنہ قسم بخدا، دوسری شادی کروں گا ہی نہیں ـــــ تم ایک منہ بند کلی ہو، دردانہ سے بھی زیادہ ستم رسیدہ، ایک کنواری جوانی کو جاگیرداری کی بھینٹ چڑھا کر اس کے شعلہ بداماں جذبات پر برف کی ایک سل رکھ دی گئی۔ اس سے بڑا ظلم بھی کسی عورت پر ہو سکتا ہے، کہ وہ دنیا کی نظر میں بیاہتا اور بیوہ ہونے کے باوجود کنواری کی کنواری رہے ـــــ مجھے بیوہ سے نکاح کر کے ثواب کمانا ہے، تو پورا ثواب کماؤں گا تھوڑا نہیں۔ آج مجھے قدرت نے موقع دیا ہے کہ ایک تن مردہ میں جان پیدا کر دوں۔ میں اس موقع کو اپنے ہاتھ سے نہیں کھو سکتا ـــــ اور پھر ایسی صورت میں، جب کہ تمہاری خود بھی یہی دلی خواہش ہے۔" ـــــ "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" کوکب نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا ـــــ "یہ بات ہے اور بالکل ہے۔ تم کیوں اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ محبت کی الگ ایک زبان ہوتی ہے جس کو کہنے والا اور سننے والا دونوں خوب سمجھتے ہیں، ذرا تم اپنے اس جذبہ کو یاد کرو جس کے تحت تم نے پہلی ملاقات میں مجھے "تم" کہنے پر آمادہ کیا، اور اس ایک لفظ "تم" میں اپنی ساری درد کی کہانی کہہ کر مجھے اپنی محبت میں گرفتار کر لیا ـــــ اور آج پھر "حسن طلب" کے طور پر مجھے اس راہ پر لا رہی ہو ـــــ بس، اب تکلف

چھوڑو اور سیدھے طور پر میری پیش کش پر "ہاں" کہہ دو۔" محبوب کا یہ جواب سن کر کوکب نے محسوس کیا کہ اس کے دل کا چور پکڑا گیا۔ وہ کچھ جھینپی، آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی اور وہ ایک لوٹی ہوئی شاخ کی طرح محبوب کی باہوں میں جھول گئی ——

ن ب ن ب ن ب ن

میرے بچّے!

۱۔ الوالخیر محمد عقیل مرحوم، بی کام۔ سابق بینک آفیسر نیشنل بینک آف پاکستان، لندن برانچ۔

۲۔ الوالخیر محمد شکیل بی اے، کلریکل آفیسر، منسٹری آف ہیلتھ برطانیہ گورنمنٹ لندن۔

۳۔ مسز عزیز فاطمہ جمیل رؤف ایم اے۔ ایم ایڈ۔ گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول مشن روڈ کراچی

۴۔ الوالخیر محمد سعید ایم بی اے۔ ایم اے۔ بی کام۔ ایل ایل بی۔ ڈپٹی منیجر (فائنینس) نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ، کراچی۔

۵۔ الوالخیر محمد رشید بی اے۔ بی ای (سول)۔ اے ایم آئی پی۔ اے ایم اے، ایس، سی، پی۔ چیف انجنیئر۔ حیدری بورنگ اینڈ پائلنگ کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی

۶- مسز نفیس فاطمہ جمیل محمود ایم ،اے - ایم ،ایڈ - گورنمنٹ گرلس سیکنڈری اسکول، جیکب لائینز، کراچی

۷- ابوالخیر محمد علی بی ،ای (سول) سینیئر انجنیئر، کیمنس پاکستان لمیٹڈ ،کراچی

۸- مسز غزالہ فاطمہ صدیقی ایم ،اے - بی ،ایڈ اٹاوا ، ایلی نوائس امریکہ -

۹- ابوالخیر محمد شوکت علی (جس نے نو سال کی عمر میں میٹرک پاس کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا) امسال اٹھارہ سال کی عمر میں بی ،ای (سول انجنیئرنگ) کے فائنل امتحان میں شریک ہو رہا ہے -

میرے چھوٹے بھائی بہن

۱- ابوالخیر احمد کریم - کلکٹر آف کسٹمز اینڈ سینٹرل اکسائیز (ریٹائرڈ) کراچی

۲- ابوالخیر احمد حسن مرحوم پرسنل اسسٹنٹ ،گورنر - یو ،پی

۳- ابوالخیر محمد فضل الرحمان سینیئر کسٹمز آفیسر ، کراچی

۴- مسز کنیز فاطمہ اسحٰق مرحومہ -

میرے کچھ ہونہار شاگرد

۱۔ پروفیسر علی محسن صدیقی چیئرمین اسلامک ہسٹری ڈپارٹمنٹ یونیورسٹی آف کراچی۔

۲۔ پروفیسر علی اوسط صدیقی، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، کراچی

۳۔ عطاءاللہ خان وائس پریسیڈنٹ، یونائیٹیڈ بینک کراچی

۴۔ سجاد صدیقی آرٹسٹ، ہفتہ وار "اخبارِ جہاں" کراچی

۵۔ حکیم محمد یامین، سعود آباد۔ کراچی

۶۔ مولانا سید متین ہاشمی ریسرچ ایڈوائزر، دیال سنگھ لائبریری، لاہور

۷۔ خواجہ مقصود احمد ایم اے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول کلیٹن روڈ۔ کراچی

۸۔ خواجہ امیر حسن ایسوسی ایٹڈ انجنیر، سیمنس پاکستان انجنیرنگ لمیٹڈ۔ کراچی

۹۔ سید ظفر اویس اکاؤنٹنٹ زیل پاک لمیٹڈ۔ حیدر آباد۔

۱۰۔ ڈاکٹر سید سلیمان اویس، شکاگو۔ امریکہ

۱۱۔ محمد صابر خان جیالوجسٹ، پی، ای، ڈی، سی۔

۱۲۔ پروفیسر جمیل احمد عربک ڈیپارٹمنٹ، یونیورسٹی آف کراچی۔

۱۳۔ رام چندر شرما۔ سی، ای (روڑکی) سپرنٹنڈنگ انجنیر، بنارس ڈویژن۔ یو، پی۔ انڈیا۔

۱۴۔ اویناش چندر رائے۔ ڈسٹرکٹ پلاننگ آفیسر، بنارس۔

۱۵۔ ڈاکٹر سریش چندر رائے۔ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس۔ غازی پور۔

۱۶۔ علی اصغر، ایس، ڈی، او، ٹیلی فون۔ کراچی